قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ

دینی تعلیم پر اجرت

سے متعلق اکابر علمائے دیوبند کے نظریات

نیز

اس سلسلہ میں تازہ تحریر کا جائزہ

مرتب

(مولانا) محمد مطیع الرحمن مظاہری

مہتمم مدرسہ عبیدیہ ٹرسٹ جہاں نما حیدرآباد (تلنگانہ) انڈیا

قُلْ مَآ أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَآ أَنَا۠ مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ

دینی تعلیم پر اجرت

سے متعلق اکابر علمائے دیوبند کے نظریات

نیز

اس سلسلہ میں تازہ تحریر کا جائزہ

مرتب

(مولانا) محمد مطیع الرحمن مظاہری

مہتمم مدرسہ عبیدیہ ٹرسٹ جہاں نما حیدر آباد (تلنگانہ) انڈیا

فہرست مضامین

عرض مرتب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیّٖنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ. أَمَّا بَعْدُ!

اللہ تعالی کا بے انتہاء شکر ہے جس نے دین وشریعت کی حفاظت اور اشاعت کے لیے مدارس اور تبلیغ کا نظام دنیا میں قائم فرمایا اور دین کی سچی تڑپ رکھنے والوں کو اس پندرہویں صدی میں بھی وجود عطا فرمایا اور ہر ایک کو اپنی ذمہ داری نبھانے کی فکر عطا فرمائی۔

امت مسلمہ کے جو موجودہ احوال ہیں کہ چاروں طرف سے ارتداد اور لادینی کے سیلاب کی خبریں ہیں ایسے میں اس وقت کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ امت کے تمام اہل خیر مجتمع ہو کر اس کے سد باب کی کوشش کریں اور تعاون علی البر والتقویٰ کی شکلیں قائم کی جائیں، لیکن وقت کے اس اہم تقاضے کے برخلاف سال گزشتہ ایک تحریر عام ہوئی تھی جس سے اہل مدارس اور اہل تبلیغ میں دوریاں پیدا ہونے کا شدید خطرہ محسوس کیا گیا، اور اس تحریر کی بنیاد بھوپال اجتماع کے جس بیان کو بنایا گیا تھا جب اس تحریر کا اس بیان کے آڈیو سے مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس بیان کے ضبط کرنے میں انتہائی جلد بازی اور بے احتیاطی ہی نہیں بلکہ دیدہ ودانستہ اس میں ردوبدل اور حذف واضافہ کیا گیا ہے اور اس میں شدت پیدا کرنے کے لیے اور قاری کو متاثر کرنے کے لیے اس میں اور بھی نامناسب حرکتیں کی گئی ہیں، معتدل اور حق پسند لوگوں کے سامنے معاملے کو واضح کرنے کے لیے ''تعلیم وتعلم سے متعلق اکابر علمائے دیوبند کے نظریات'' کے نام سے ہم نے ایک رسالہ ترتیب دیا تھا جس کے شائع ہونے کے بعد کافی حد تک غلط فہمیاں الحمد للہ دور ہو گئی تھیں، لیکن اسی مذکورہ بالا تحریر کو بنیاد بنا

کراس سے بھی زیادہ سخت اوراس سے بھی زیادہ جلد بازی اور بے احتیاطی سے بھرپور ایک دوسری تحریر عام ہوگئی جس نے دل ودماغ کو ہلاکر رکھ دیا، دوستوں کا اصرار ہوا کہ اس کی بھی وضاحت ضروری ہے لیکن دو وجہ سے اس کی بالکل بھی ہمت نہیں ہوئی، پہلی وجہ تو دعوت کی محنت اور اپنے مدرسے کی مشغولی تھی، دوسری اور اصل وجہ اپنی کم مائیگی اور کم علمی تھی، کیونکہ اس کی تحقیق کے لیے جس اہلیت کی ضرورت تھی وہ بندے کے اندر بالکل بھی نہیں ہے، لیکن جب دوستوں کا اصرار بڑھا تو پھر اپنے انہی محترم متعلقین سے دوبارہ رابطہ کیا کہ جن کی رہبری کی مجھے ہر قدم پر ضرورت پڑتی ہے، مگر ظاہر ہے کہ ان حضرات کے دعوتی و تعلیمی مشاغل کثیرہ کی وجہ سے ان کے لیے بھی اس بڑے کام کے لیے وقت نکالنا آسان نہیں تھا لیکن اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف فرما کر ہر قدم پر میرا بھرپور تعاون کیا ورنہ میرے اندر ایک سطر بھی لکھنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ **فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ عَنِّيْ وَعَنْ سَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ خَيْرَ الْجَزَاءِ**۔ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ اس حقیر کی اس کوشش اور کاوش کو امت مسلمہ کے لیے خیر کا ذریعہ بنادے۔ فقط والسلام

(مولانا) محمد مطیع الرحمن مظاہری
مہتمم مدرسہ عبیدیہ ٹرسٹ جہاں نما حیدرآباد (تلنگانہ) انڈیا
بروز جمعہ، ۲۵ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ مطابق ۱۰ نومبر ۲۰۲۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمہید

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا، وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. أَمَّا بَعْدُ!

اس میں کوئی شک نہیں کہ امت کی ہر نازک موڑ پر رہبری کرنے کی ذمہ داری علماء کے کندھوں پر ہے'' اور اگر کوئی شخص کم علمی اور طبیعت کی آزادی کی وجہ سے قرآن وحدیث اور سیرت صحابہ میں مجتہدانہ انداز سے غور وفکر کر کے دور از کار اجتہادات کرنے کی روش پر چل رہا ہو جس کی وجہ سے شاذ اور منکر اقوال وآراء اور غلط و گمراہ کن افکار ونظریات یکے بعد دیگرے مسلسل سامنے آرہے ہوں اور وہ شخص دین کے سلسلہ میں بے راہ روی کا شکار ہو تو حق کے معاملہ میں کسی سے متاثر ہوئے بغیر عوام کو حکمت اور حسن تدبیر کے ساتھ اس کے غلط افکار میں ملوث ہونے سے بچانا علماء دین کا ایک اہم فریضہ ہے۔''

لیکن جب کسی معین شخص کے متعلق کوئی اصلاحی کوشش کی جائے اور اس سلسلہ کی کسی تحریر کو شائع اور عام کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہو تو اس سلسلہ میں کوئی قدم یا قلم اٹھانے سے پہلے اس شخص کے بارے میں ہر طرح سے تحقیقات کر لینا اور اس کے تمام افکار ونظریات کو اچھی طریقہ سے سمجھ لینا بہت ضروری معلوم ہوتا ہے، خاص طور پر جب کہ اختلافات کا دور دورہ ہو اور اس شخص کے مخالفین اس کو ہر طرح سے بدنام کرنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہوں اور آپ کا یہ دعوی ہو کہ ہم اس اختلاف سے بالکل الگ ہیں نہ کسی کے حامی ہیں نہ کسی کے مخالف۔

ایسے میں جس شخص کے ہزار ہا ہزار بیانات ہوں اس کے سیاق وسباق سے کٹے ہوئے چند اقتباسات اور صرف ایک مکمل بیان، وہ بھی ایسا کہ جس میں قطع وبرید ثابت ہو چکی

ہے(۱)ان کی بنیاد پر اتنی سخت تحریر عام کرنا انتہائی موجب تشویش ہے۔

مجمع کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف مواقع میں مختلف انداز سے بات کرنی پڑتی ہے حدیث میں بھی بعض مواقع پر شراح فرماتے ہیں کہ یہ سائل کی نوعیت کے اعتبار سے ہے، عام نہیں ہے اکابر کی تقاریر و تحریرات میں اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

ضرورت اس بات کی تھی کہ اگر آپ کو اس کی بعض باتوں پر اشکالات تھے اور آپ کے پاس اس کے تمام یا اکثر بیانات کا جائزہ لینے کی فرصت نہیں تھی تو جب وہ خود آپ کی طرف بار بار رجوع کر رہا ہے تو آپ اس سے براہ راست گفتگو کرتے اور خود اس سے اس کے عقیدہ کے بارے میں تحقیق کرتے یا کم از کم اس کے حامیوں اور اس کو قریب سے جاننے والوں سے تحقیق کرتے یہی وجہ ہے کہ جب اس طرح کی تحریرات عام ہوتی ہیں تو شخص مذکور سے مکمل واقفیت رکھنے والے ہکابکا رہ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب سے اس طرح کی تحریرات عام ہونے لگی ہیں اس وقت سے شخص مذکور نے اپنے بیانات میں علماء و مدارس کے احترام و تعاون کی ترغیب کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے تاکہ ان تحریرات کی وجہ سے اس سے محبت رکھنے والے اپنے اکابر سے دل برداشتہ نہ ہو جائیں ''علماء کو دنیا کا سب سے بڑا محسن سمجھنے''، ''ٹوکنے والے علماء کو اپنا محسن سمجھنے''، ''ٹوکنے والے علماء کو لوگوں کے لیے سب سے بڑی خیر سمجھنے''، ''مدارس کو اسلام کا قلعہ یقین کرنے''، ''ہر جگہ کی عوام کو علماء اور مدارس و مکاتب سے جوڑنے کو اس محنت کا بنیادی مقصد قرار دینے'' کی تاکید و تحریض اسی سلسلہ کی کڑی ہیں، اپنے بیانات میں بعض کام کرنے والے ساتھیوں کے علماء سے اعراض پر تنقید کرنا اور جماعت میں وقت لگائے ہوئے علماء کو وقت نہ لگانے والوں سے افضل سمجھنے کو بڑی چوک قرار دینا ان سب کا مقصد بھی یہی ہے، مذکورہ باتیں مختلف رسائل میں چھپ کر عام ہو چکی ہیں۔(۲)

(۱) ملاحظہ ہو: تعلیم و تعلم سے متعلق اکابر علمائے دیو بند کے نظریات، ص: ۴۵-۴۶

(۲) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ملفوظات حضرت جی مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی مدظلہ العالی، تعلیم و تعلم سے متعلق اکابر علمائے دیو بند کے نظریات، بھوپال اجتماع ۲۰۲۲ء میں مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی کا ایک بیان مرتبہ علماء ایم، پی

(۱)

تنخواہ سے متعلق شخص مذکور کا نظریہ

حیرت کی بات یہ ہے کہ قوم کی دینی خدمت میں محبوس ومشغول ہونے کی بنیاد پر مسلمانوں کے ذمہ علماء وطلبہ کی مالی خدمت کے واجب اور ضروری ہونے اور مدارس کے لیے تکثیر چندہ اور طلبہ کے لیے افزائش قیام وطعام کی سعی کے مضمون کو (جو کہ اس تحریر کا اصل موضوع ہے) حضرت نانوتوی، حضرت تھانوی ودیگر علماء رحمۃ اللہ علیہم سے اس انداز سے نقل کیا گیا جیسے شخص مذکور کا عقیدہ ونظریہ اس کے خلاف ہے۔

ہم آپ سے عرض کرتے ہیں کہ آپ کے پاس اگر تمام بیانات کا جائزہ لینے کی فرصت نہیں تھی تو کم از کم مفتی حسام الدین صاحب قاسمی نے چند بیانات سے اخذ کر کے جو ملفوظات مرتب کئے ہیں جو پانچ سال پہلے چھپ چکے ہیں اور ملک وبیرون ملک عام ہو چکے ہیں اسی کو دیکھ لیا ہوتا۔

مذکورہ کتاب کے ص: ۳۵ پر تحریر ہے: فرمایا: اگر کسی کو دین پڑھانے قرآن سکھانے اور علم سکھانے کے لیے تنخواہ ملتی ہے تو یہ اس کے پڑھانے کا بدل نہیں ہے بلکہ یہ اس شغل کا بدل ہے جس مشغلہ (تجارت وغیرہ) سے اس کو ہٹا کر پڑھانے پر لگایا گیا ہے'' ص: ۴۲ پر تحریر ہے فرمایا: ''مولانا الیاس کے خطوط میں باقاعدہ مکتب کی ضرورت، اس کے قیام اور اس کی تنخواہ کا انتظام کرنے کا ذکر ملتا ہے'' ص: ۱۴ پر تحریر ہے فرمایا: ''مدارس کے تعاون کو اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف سمجھو''، فرمایا: ''مدارس پر خرچ کرنا سب سے بڑا صدقۂ جاریہ ہے''، ''جو مال اپنی خواہشات پر خرچ کر رہے ہو اسے خواہشات سے بچا بچا کر مدرسوں پر خرچ کرو''۔

(۲)

اکابر کے اتباع کی تلقین کے باوجود

اتباعاتِ اکابر پر اعتراضات

مذکورہ تحریر کے ص: ۱۷ پر درج اس تلقین کے باوجود کہ ''مقرر صاحب پر ضروری ہے کہ اس طرح کے بیانات سے کلی اجتناب کریں بیانات میں سلف صالحین اور ہمارے اکابر کی تشریحات کا اتباع کریں اور ان سے سرمو انحراف کر کے انتشار و خلفشار کا باعث نہ بنیں، یہی سلامتی کا راستہ ہے اور اسی میں ہم سب کے لیے خیر ہے''، اسی تحریر میں مقرر صاحب کی ایسی متعدد باتوں پر اعتراض کر دیا گیا جو اکابر اور سلف صالحین کی اتباع میں کی گئیں تھیں۔

مثلاً:

(الف) علماء کو علمی مشغولی کے ساتھ تجارت کی ترغیب دینے پر اعتراض

حالاں کہ خود آپ کی تحریر سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت ملنے تک ۲۳ سال تمام علمی مشاغل کے ساتھ تجارت کرتے رہے، یہاں تک کہ آپ کی تحریر میں صفحہ: ۲۲ میں ہے ''وکان رجلا تاجرا یغدو کل یوم الی السوق فیبیع ویبتاع''، بلکہ بعض روایات میں آیا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلافت کی ذمہ داری ملنے سے پہلے تک قریش کے سب سے بڑے تاجر تھے۔

عن عائشة رضي الله عنها قالت كان ابو بكر رضي الله عنه اتجر قريش حتى دخل في الامارة—وفي رواية—قال ابو بكر: يا بنية

اني كنت اتجر قريش واكثرهم مالا - وفي رواية - عن ابن سيرين قال نبئت ان ابابكر كان اتجر قريش. (۱)

اور آپ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ سے بھی صراحت کے ساتھ ،صفحہ: ۲۵ پر ابن اثیر کی تاریخ کے حوالے سے نقل کیا ہے: "**إني كنت إمرأ تاجرا يغني الله عيالي بتجارتي وقد شغلتموني بأمركم هذا**" اور یہی حال باقی خلفاء اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا رہا کہ انہوں نے علم وکسب کو جمع کیا، امور خلافت میں مشغولی تو تجارت سے مانع ہوئی لیکن علمی مشغولی تجارت سے مانع نہیں ہوئی اور یہ بات کسی سے مخفی نہیں کہ یہ حضرات نئے اسلام میں داخل ہونے والوں کو وضو نماز وقرآن کی تعلیم سے لے کر افتاء تک کی ذمہ داریاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں انجام دیتے تھے اور آخر تک ان میں مشغول رہے، التراتیب الاداریۃ میں ابن الجوزی وغیرہ سے خلفاء اربعہ سمیت ایسے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام نقل کئے گئے ہیں جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں فتوی دیتے تھے، نیز التراتیب الاداریۃ میں باقاعدہ ایک باب منعقد کیا ہے: "**باب ذكر أن التاجر منهم كان يتعلم والمتعلم منهم كان يتجر**" یعنی ان کا تاجر علم حاصل کرتا تھا اور ان کا طالب علم تجارت کرتا تھا، نیز ایک مستقل باب میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے مختلف پیشوں اور صناعات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، نیز امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے **باب كسب الرجل وعمله بيده** میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ اثر بھی نقل کیا ہے: "**كان أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم عمال انفسهم**"

حیرت کی بات یہ ہے کہ ص: ۱۴ پر محرر صاحب نے موصوف پر تو یہ اعتراض کر ڈالا کہ "پوری مدت خلافت میں تجارت سے باز رہنے کے عمل سے موصوف صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف یہ نسبت نہ کر سکے کہ وہ تجارت کو امور خلافت میں مخل سمجھتے تھے"، لیکن خود محرر صاحب "خلفاء اربعہ کے خلافت ملنے تک اور اسی طرح دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کے زندگی بھر کے

---

(۱) رواه ابن ابي شيبة (۲۲۶۲۱) و(۲۲۶۲۳) وعبد الله بن احمد في الزهد (۵۷۲) والخلال في الحث على التجارة (۵۸)

کسب وتجارت کے عمل سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف یہ نسبت نہ کرسکے کہ وہ حضرات چاہے امور خلافت میں تجارت کو مخل سمجھتے ہوں لیکن تعلیم وتعلم اور تفقہ وافتاء میں وہ تجارت کو ہرگز مخل نہیں سمجھتے تھے'' حالانکہ مسئلہ مبحوث فیہا بھی تعلیم وتعلم کا ہے خلافت کا نہیں۔

اسی طرح قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام احمد اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کی تجارتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔(۱)

نیز حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمۂ فتح الباری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تجارت کی تفصیل بیان کی ہے۔

ان کے علاوہ مشاہیر ائمہ کی تجارتوں کے تذکروں سے تاریخ وتراجم کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی علماء کو تجارت کی ترغیب کچھ اس انداز سے دیتے ہیں:

يا معشر القراء! ارفعوا رؤوسكم ما اوضح الطريق فاستبقوا الخيرات ولا تكونوا كلا علي المسلمين — وفي رواية — عيالا على المسلمين. (۲)

ترجمہ: ''اے جماعت علماء/طلبہ! سر اٹھا کے چلو (اور دیکھو) راستے کتنے واضح ہیں!! اور خیر کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لو، اور مسلمانوں پر بوجھ نہ بنو''۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھوپال اجتماع میں علماء کی مجلس میں فرمایا: میرے بزرگو دوستو! سو فیصد علماء کی اس میں لگنے کی (ضرورت ہے) اپنی ہمت اور طاقت کے بقدر ہو اور اپنے خرچے سے ہو، صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے خرچے سے لگے تھے، عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے خرچے سے لگے تھے، عثمان غنی رضی اللہ عنہ جو بہت ہی مالدار تھے وہ خرچ

---

(۱) تفصیل کے لیے دیکھئے سیرتِ ائمۂ اربعہ

(۲) رواه البيهقي في شعب الايمان (۱۲۱۷-۱۲۱۶)

اپنا بھی کرتے تھے اور دوسروں کا بھی کرتے تھے، اتنے بڑے عالم تھے اور اتنے بڑے مفتی وقاری تھے ... اپنے اوپر بھی خرچ کرتے تھے اور دوسروں پر بھی خرچ کرتے تھے یہ مفتی تھے اور بڑے قاری تھے اور اپنے وقت کے امام تھے اور مسجدوں کے بھی امام تھے، عبادتوں کے بھی امام تھے اور ولایتوں کے بھی امام تھے اور انھوں نے اپنا بھی خرچ کیا اور اپنے خرچ سے دوسروں کو بھی بھیجا، میرے بزرگو اور دوستو! اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے پر ابھارا گیا، علماء کو بھی ابھارا گیا عوام کو بھی ابھارا گیا پوری امت کو بھی کہ اپنی جان بھی لگاؤ مال بھی لگاؤ، قرآن کریم میں کبھی جان مقدم کبھی مال مقدم کہیں: "**باموالکم وانفسکم**" ہے، کہیں "**بانفسکم واموالکم**"... الخ (۱)

حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حیاۃ الصحابہ میں باقاعدہ "**الجمع بین الکسب والعلم**" کا باب منعقد فرمایا ہے۔

فتاوی دارالعلوم دیوبند کے مقدمہ میں تحریر ہے: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب تک کسی میں پانچ چیزیں نہ ہوں مسند افتاء کو زینت بخشنے کی جرأت نہ کرے۔ (۱) نیت صالحہ (۲) حلم ووقار (۳) مسائل میں بصیرت اور ان پر ثابت قدمی کی شان (۴) بقدرِ ضرورت ذرائع معاش (۵) لوگوں کے احوال کی معرفت ..... بقدر ضرورت ذرائع معاش کی قید غالباً اس لیے لگائی ہے کہ وہ عوام کی نگاہوں میں ہلکا نہ ہوجائے اور کسی کو اس کی جرأت نہ ہو کہ وہ مفتی کو حرص ولالچ میں ڈالنے کی بات سوچ بھی سکے۔ (۲)

اسی طرح تاریخ دارالعلوم میں تحریر ہے: یہ تو ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں دارالعلوم کے طلباء پر تعلیم وتدریس اور تبلیغ ودینی قیادت کے علاوہ عام معاشی راہیں کشادہ نہیں ہیں، دارالعلوم میں اس امر کا احساس کرتے ہوئے ضروری سمجھا گیا کہ طلباء کے مستقبل کے لیے معاش کے ذرائع مہیا کیے جائیں، تاکہ وہ دارالعلوم سے نکلنے پر فراغت واطمینان سے

---

(۱) مواعظ عبیدیہ ۲: ۳۱۸/-۳۱۹

(۲) فتاویٰ دارالعلوم دیوبند مدلل ومکمل: ۱/۸۱

مستغنیانہ زندگی بسر کرسکیں، شعبۂ خوشخطی کے قیام میں اصلاح خط کے ساتھ ایک یہ مقصد بھی پیش نظر تھا، حق تعالے جزاء خیر عطا فرمائے مولانا عبدالغفور صاحب بخاری کو جو اس وقت دارالعلوم کی مسجد کے امام تھے اور بعد میں مدینہ منورہ ہجرت کر کے چلے گیے اور وہیں وفات پائی، اُن کی مخلصانہ سعی وامداد سے اس شعبے کا قیام عمل میں آیا، اور جلد سازی کے کام سے شعبے کا آغاز ہوا، موصوف بخارا کے رہنے والے تھے بمبئی میں ان کا اچھے پیانے پر جلد سازی کا کارخانہ تھا، ان کو خود بھی اس کام میں اچھی دستگاہ حاصل تھی، بمبئی کے قیام کے زمانے میں ان کو دینی علوم کے حصول کا شوق دامن گیر ہوا، اور دارالعلوم کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے منتخب کیا، جلد سازی کی مشین، آلات اور اس سلسلے کا دوسرا سامان جو کچھ ان کے پاس تھا وہ دارالعلوم کو وقف کر دیا، چنانچہ انہی کے وقف کردہ سامان سے رجب ۱۳۶۵ھ میں شعبۂ تجلید سے دارالصنائع کا افتتاح عمل میں آیا، موصوف نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خود اپنی خدمات بھی بغیر کسی معاوضے کے دارالصنائع کے لیے پیش کر کے ایسے لوگ تیار کر دیے جو طلباء کو تجلید کی تعلیم دے سکیں، اس کے بعد دارالصنائع میں مختلف اوقات میں دوسری صنعتوں کی تعلیم کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔(۱)

نیز تحریر ہے: حسن تحریر کے علاوہ جو طلباء خوش نویسی (کتابت) کی تعلیم بحیثیت فن حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو فنی لحاظ سے اس کی مشق کرائی جاتی ہے اس طرح پر خط کی اصلاح کے علاوہ یہ شعبہ طلباء دارالعلوم کے لیے حصول معاش کا بھی ایک باعزت اور عمدہ ذریعہ ہے۔(۲)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک رائے یہ ہے کہ مدارس اسلامیہ کے ماتحت صنعت وحرفت کا شعبہ ضرور ہونا چاہیے؛ تاکہ فراغ کے بعد کسی کے محتاج نہ ہوں، یہ ضرب المثل ہے کہ یہ لکھ پڑھ کر اور کچھ نہیں کر سکتے سوائے چندہ مانگنے کے۔(۳)

---

(۱) تاریخ دارالعلوم ص: ۳۱۲-۳۱۳

(۲) تاریخ دارالعلوم ص: ۲۱۲

(۳) ملفوظات حکیم الامت: ۴۲۹/۲

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری جگہ فرمایا: اہل علم کوتو علوم شرعیہ کے علاوہ کوئی ہنر بھی سکھانا چاہیے، میری زیادہ رائے یہ ہے کہ تھوڑی کھیتی کرلیا کریں مگر صرف ضرورت بھر....... لوگ عربی کو ذریعۂ معاش بنا لیتے ہیں اس علم کوتو جو کوئی پڑھے تو مقصود اصلاح نفس ہی ہونا چاہیے، رہی معاش کی بات سو اس کے لیے کچھ اور ہی ہونا چاہیے، تجارت، زراعت، حرفت وغیرہ اور عربی کو ذریعۂ معاش بنانے کے قصد سے پڑھنا ٹھیک نہیں۔(۱)

اور ایک جگہ فرمایا: صنعت وحرفت یعنی دستکاری و پیشہ سے معاش حاصل کرنے میں بہت آسانی وسلامتی ہے، عربی کی تکمیل کرنے والوں کے لیے چند صورتیں معاش کی مناسب ہیں۔(۱) اسکول میں نوکری کرلینا (۲) مطب کرنا (۳) مفید رسالے یا حواشی تصنیف کرکے یا درسی کتابیں چھپوا کر ان کی تجارت کرنا (۴) کاپی نویسی کرنا (۵) کسی مطبع میں تصحیح کی نوکری کرنا اور سب صورتوں میں اوقات فراغ میں مطالعہ وتدریس کا شغل رکھنا، یا کسی اسلامی مدرسہ میں مدرسی کرنا۔(۲)

اس سلسلے میں قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ائمۂ دین نے کبھی علم دین کو ذریعۂ معاش نہیں بنایا اور نہ اس سے کسی قسم کا دنیاوی مفاد حاصل کیا، بلکہ دینی خدمت کے طور پر تعلیم وتعلم، تحدیث وروایت، تفقہ وافتاء اور رشد وہدایت کے کام کے ساتھ معاش ومعیشت کے لیے ذاتی کاروبار کرتے تھے، اور عبرت پذیری کے لیے ان کے نام ونسب کے ساتھ ان کے پیشوں کی نسبت بھی بیان کی جاتی تھی، متقدمین ائمہ دین کے ناموں کے ساتھ بزاز (پارچہ فروش)، خزاز (حریر فروش)، زیات (روغن فروش) سمان (سمن

---

(۱) العلم والعلماء جدید ۱۵۸-۱۵۹ بحوالہ الافاضات الیومیہ

(۲) العلم والعلماء ص: ۱۵۹

فروش) حناط (گندم فروش) حطاب (ہیزم فروش) بزار (غلہ فروش) وغیرہ کی نسبت عام طور سے کتابوں میں پائی جاتی ہے، امام ابوحنیفہ بھی خزاز یعنی حریر فروش تھے، اور یہ ان کا خاندانی پیشہ تھا، ان کے یہاں ریشم بنانے اور ریشمی کپڑے تیار کرنے کا بہت بڑا کارخانہ تھا جس میں بہت سے کاریگر اور مزدور کام کر کے اپنی روزی کماتے تھے۔ اور ریشمی کپڑوں کی بہت بڑی دکان بھی تھی جس میں کارخانے کے تیار شدہ ریشمی کپڑے فروخت ہوتے تھے، امام ذہبی نے لکھا ہے:

وكان من أذكياء بني أدم جمع الفقه، والعبادة، والورع، والسخاء، وكان لا يقبل جوائز الدولة، بل ينفق ويوثر من كسبه، له دار كبيرة لعمل الخز، وعنده صناع واجراء،

ابوحنیفہ ذہین ترین انسانوں میں سے تھے، انھوں نے فقہ، عبادت، پرہیزگاری اور سخاوت کو اپنی ذات میں جمع کیا تھا، اور حکومت کے عطیے قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ خود اپنی کمائی سے دوسروں پر خرچ کرتے تھے اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے، ان کے یہاں ریشم بنانے اور ریشمی کپڑا بننے کا بہت بڑا کارخانہ تھا جس میں بہت سے کاریگر اور مزدور کام کرتے تھے۔ (۱)

علمی مصروفیت کے ساتھ امام صاحب تجارت کس غرض سے کرتے تھے اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: امام صاحب کا وسیع وعریض کاروبار تجارت جائز ذریعۂ معاش اس فارغ البالی کی بناء پر ائمہ وامراء کے تحفوں سے خود کو محفوظ کرنا تھا۔۔۔۔ امام صاحب آخر دور تک علمی مصروفیات اور مشاغل کے باوجود کسب معاش کے لیے تجارت سے وابستہ رہے، جس کی بنا پر آپ نے خود اعتمادی، بے لوث خدمت اور حق کے لیے جرأت و بے

(۱) سیرت ائمۂ اربعہ: ۶۸

باکی کا ملکہ پیدا کیا اور امراء وخلفاء کے تحائف اور نذرانوں کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔(۱)

اکابر کی ان تمام تقاریر اور تحریرات کی روشنی میں آپ خود غور فرمائیں کہ شخص مذکور کا علم وکسب کو جمع کرنے کی ترغیب دینا اپنے اکابر کا اتباع ہے یا اس سے انحراف؟ اور کیا ان اکابر کا بھی دینی خدمات میں مشغول ویکسو رہنے والے افراد کو تجارت اور اسباب معیشت اختیار کرنے کی ترغیب دینا بالکل غلط اور مبنی بر جہالت ہے؟ اور یہ بیانات بھی از روئے شرع درست نہیں ہیں؟ اور ان جیسے بیانات کو بھی آگے پھیلانا اور کسی بھی ذریعے سے اس کی نشر واشاعت کرنا جائز نہیں ہے؟ اور کیا وہ تمام ائمہ دین جو بقول قاضی اطہر مبارک پوری کے تعلیم وتعلم، تحدیث وروایت، تفقہ وافتاء کے کام کے ساتھ معاش ومعیشت کے لیے ذاتی کاروبار کرتے تھے ان تمام کے علوم خلل پذیر تھے؟

(ب) شخص مذکور کے عوام کو عملاً تجارت سکھانے کی ترغیب کو بھی بے بنیاد اور مبنی بر جہالت قرار دیا

حالانکہ مولانا عبید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بیان میں فرمایا: ہم پڑھانے کے لیے صرف اس مدرسہ ہی کو مدرسہ قرار نہ دیں، بلکہ پوری دنیا کو مدرسہ قرار دیں، جس طرح کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری زمین کو مسجد قرار دیا اور ساری زمین کو طہور بھی قرار دیا "جعلت لی الأرض مسجدا وطهورا" اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد نبوی میں مدرسہ کھولا اور ساری مسجد اور بازار کو بھی مدرسہ قرار دیا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حیات طیبہ میں مبارک سنتوں کو پہچانا اور پھیلانا ہے اور اس کے لیے صرف ایک ہی مدرسہ نہیں قرار دیا بلکہ پوری دنیا کو مدرسہ قرار دیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بازار جا رہے ہیں لیکن کیوں جا رہے ہیں؟ وجہ معلوم نہیں، وہاں ایک غلہ بیچنے والا غلہ بیچ رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا اوپر غلہ خشک ہے ہاتھ اندر ڈال کر اوپر کیا تو اندر سے بھیگا ہوا نکلا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے بیچنے والے یہ کیا ہے؟

---

(۱) سیرت ائمۂ اربعہ: ۵۴

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "من غشنا فلیس منا" جس نے ہمیں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے تو اس بات کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بازار میں جا کر کہا تو اگر اس علم پر محنت کے ساتھ ساتھ عوام میں بھی محنت کر لی تو خدا اس علم سے ہدایت کا دروازہ کھول دیں گے۔(۱)

اور مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں: موجودہ صنعتی دور نے تجارت ومعیشت کے شعبے میں ایسے پیچیدہ معاملات کو رواج دیا ہے کہ اب ایک مسلمان تاجر کو قدم قدم پر معاملات کی نئی نئی صورتیں پیش آتی ہیں ان صورتوں کا صریح شرعی حکم فقہ کی مروجہ کتب میں اس لیے نہیں مل سکتا کہ یہ صورتیں عصر جدید ہی کی پیداوار ہیں، اور ان کا تصور پہلے نہیں ہوسکتا تھا، ان صورتوں کو سمجھ کر ان کا صحیح فقہی حکم بتانا علماء ہی کا کام ہے، اور یہ کام اسی وقت ٹھیک ٹھیک انجام پا سکتا ہے جب علماء ان صورتوں کو ان کی تمام تفصیلات اور پس منظر کے ساتھ سمجھیں اور اس کے بعد فقہی اصولوں کے مطابق ان کا حکم بتائیں، اب تک ہوتا یہ ہے کہ صورت مسئلہ بیان کرنے کی ذمہ داری مستفتی پر ہوتی ہے؛ اس لیے وہ جیسا سوال لکھ لاتا ہے، اس کے مطابق جواب چلا جاتا ہے لیکن مستفتی چونکہ عالم نہیں ہوتا اس لیے وہ بسا اوقات اپنی لاعلمی کی بنا پر صورت مسئولہ کے وہ اہم اجزاء جن پر جواب کا دارومدار ہوتا ہے، بیان نہیں کر پاتا، اس لیے جواب مختلف ہوجاتا ہے اور یہ بھی صرف ان معاملات میں ہوتا ہے جن کے بارے میں تاجر کے دل میں کوئی شبہ اور اس کی بنیاد پر استفتاء کا قوی داعیہ پیدا ہوجائے، ورنہ اب اکثریت ان افراد کی ہے جن کو کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا، یا استفتاء کا تقاضا پیش نہیں آتا۔

لہٰذا جس طرح حضرت امام محمد رحمۃ اللہ علیہ بازاروں میں گھوم گھوم کر تاجروں کے معاملات کو پہلے سے از خود سمجھنے کا اہتمام فرماتے تھے، تاکہ ان تمام معاملات کا شرعی حکم مدون کر جائیں اور استفتاء کے موقع پر مستفتی کی تشریح کے محتاج نہ ہوں، موجودہ دور کے اہل علم کا بھی یہ فریضہ ہے کہ وہ اہل عصر کے معاملات کو اچھی طرح سمجھیں اور اس کے بعد حسب

(۱) مواعظ عبیدیہ: ۲/ ۷۴-۷۵

ضرورت تصنیف وتالیف اور فتوی کے ذریعے ان معاملات کا شرعی حکم امت پر واضح کریں، اس غرض کے لیے معاشیات کا اتنا علم جس سے اہل عصر کے معاملات اور ان کے تجارتی مسائل کا علی وجہ البصیر ۃ علم ہو سکے ایک عالم دین کے لیے ضروری ہو گیا۔(۱)

(ج) اس بات پر اعتراض کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس کا عادی بنا دیا تھا کہ جو مال تمہیں تمہاری دینی خدمات کی وجہ سے پیش کیا جائے اس کو قبول مت کرنا

حالاں کہ اس سلسلہ میں احادیث مشہور ہیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ اس مضمون کے آخر میں احادیث قوس کے تحت آ ئے گی۔

(د) تجارت کے تعلیم میں مخل ہونے کے بجائے معاون ہونے کی بات پر اعتراض

حالاں کہ جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کے طرز عمل سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے جیسا کہ اعتراض نمبر (۱) میں گزرا اور مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کے سابقہ کلام اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے عمل سے بھی واضح ہے۔

ہاں اتنی بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر چہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ابتداء میں رائے یہ تھی کہ تجارت امور خلافت میں بھی مخل نہیں، لیکن بعد میں بعض صحابہ کے کہنے پر انہوں نے تجارت کو ترک فرما دیا۔

اگر چہ شخص مذکور کا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سابقہ رائے سے استدلال بھی دو وجہ سے ہو سکتا ہے، ایک تو یہ کہ صدیق بہر حال صدیق ہیں ان کی پہلی رائے بھی بالکل بے بنیاد تو نہیں ہو سکتی جب کہ انھوں نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں جرح بھی کی تھی، دوسرے اس وجہ سے کہ آخر تک بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خواہش اور تمنا اپنی سابقہ رائے کی رہی جیسا کہ ان کے وظیفہ کو واپس کرنے سے اور مذکورہ تحریر میں ص: ۴ کی درج ذیل عبارت سے واضح ہے:

"فلما حضره الموت قال قد كنت قلت لعمر إني أخاف أن لا

(۱) ہمارا تعلیمی نظام: ۱۰۲-۱۰۳

يسعني أن أكل من هذا المال شيئا فغلبني فاذا أنا مت فخذوا من مالي ثمانية آلاف درهم وردوها في بيت المال"

بلکہ ایک روایت میں تو یہ لفظ ہے: "**فلما حضرته الوفاة قال ان عمر لم يدعني حتى اصبت من بيت المال ستة آلاف درهم**"(۱) یعنی جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو فرمایا کہ میں نے عمر (رضی اللہ عنہ) سے کہا تھا کہ مجھے خوف ہے کہ اس مال میں سے کھانے کی میرے لیے گنجائش نہیں ہے لیکن عمر (رضی اللہ عنہ) مجھ پر غالب آ گئے اس لیے جب میں مر جاؤں تو میرے مال میں سے آٹھ ہزار درہم لے کر بیت المال میں واپس کر دینا اور ابن سعد کی روایت میں ہے کہ عمر نے مجھے چھوڑا ہی نہیں یہاں تک کہ میں نے بیت المال میں سے چھ ہزار درہم لے لیے۔

(ہ) شخص مذکور کے سیرت کی طرف متوجہ کرنے کو اور اسی میں کام کی ترقی اور حفاظت قرار دینے کو اور معمول اور تجربات کے بجائے سیرت کے تابع ہونے کی ترغیب وتحریض کو اور اتباع سنت ہی کو باطل کے مرعوب ہونے کا اصل سبب قرار دینے کو مورد طعن بنایا گیا حد تو یہ ہے کہ سارے انحرافات کی بنیاد اور جڑ اسی کو قرار دیا گیا، یہ انتہائی عجیب وغریب اعتراض ہے۔

محرّر صاحب کی مذکورہ معترضانہ تعبیر کتنی سنگین ہے، اگر مومن کی بات کی تاویل کا دروازہ کھلا ہوا نہ ہوتا تو یہی ایک تعبیر محرر کی تضلیل وتفسیق وتبدیع کے لیے کافی تھی، ہماری اپنی بھی کوشش یہی ہے اور قارئین سے بھی یہی التجاء ہے کہ اس عبارت کے ظاہر کا جو مطلب بنتا ہے وہ ہرگز نہ لیا جائے کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ محررین اعداء السنۃ، فرق مبتدعہ ضالہ میں سے نہیں ہیں، ویسے اس مذکورہ بالا عبارت کو سیاق وسباق سے کاٹ کر بہت خطرناک استفتاء تیار کیا جا سکتا ہے لیکن ہم ہرگز یہ کام کرنا پسند نہیں کریں گے کیوں ہم نے یہ کام شخص مذکور کے مخالفین کے لیے چھوڑ دیا ہے، **وﷲ في خلقه شؤون**۔

---

(۱) رواه ابن سعد في الطبقات: ۳/ ۱۹۳

ہم محرر صاحب سے پوچھتے ہیں: کیا آپ کو تبلیغ کی تاریخ معلوم نہیں؟ کیا آپ کو مولانا یوسف رحمۃ اللہ علیہ کے بیانات سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں؟ کیا آپ کو حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیاۃ الصحابہ اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حکایات صحابہ کی وجہ تالیف کا بھی علم نہیں؟ کیا آپ کو یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ ان دونوں کتابوں کی تعلیم کی اور انبیاء اور صحابہ ہی کے قصوں کو بیان کرنے کی اکابر تبلیغ کی طرف سے ہمیشہ کتنی تاکید رہی؟ آپ نے حیاۃ الصحابہ کی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریظ تو پڑھ لی ہوتی جس میں ہے:

أما بعد فإن السيرة النبوية وسير الصحابة وتاريخهم من أقوى مصادر القوة الإيمانية والعاطفة الدينية التي لا تزال هذه الأمة والدعوات الدينية تقتبس منها شعلة الإيمان وتشعل بها مجامر القلوب، التي يسرع انطفاؤها وخمودها في مهب الرياح والعواصف المادية، والتي إذا انطفأت فقدت هذه الأمة قوتها وميزتها وتأثيرها، وأصبحت جثة هامدة تحملها الحياة على أكتافها....

ولكن أتى على المسلمين حين من الدهر زهدوا فيه في هذا التاريخ وتناسوه، وانصرف كتابهم ومؤلفوهم ووعاظهم ودعاتهم عنه إلى أخبار الزهاد والمشايخ والأولياء المتأخرين، وطفحت الكتب والمجاميع بحكاياتهم وكراماتهم، وأولع الناس بها ولعاً شديداً، وشغلت مجالس الوعظ وحلقات الدروس وصفحات الكتب۔

وكان من أول من انتبه –على ما نعرف– في هذا العصر إلى فضل أخبار الصحابة وأحوالهم في الدعوة الإسلامية

والتربية الدينية، وإلى قيمة هذه الثروة — المطمورة في الأوراق—الإصلاحية والتربوية. وتأثيرها في القلوب، وكان من أول من أقبل عليها وعني بها وأنصف لها المصلح الكبير والداعية المشهور الشيخ محمد إلياس الكاندهلوي رحمه الله (م ١٣٦٣هـ) ، فقد عكف عليها مطالعة ومدارسة وحكاية وتذكيرا، رأيت له شغفاً عظيما بالسيرة النبوية وأخبار الصحابة رضي الله عنهم يتذاكرها مع تلاميذه وأصحابه، وتقرأ عليه كل ليلة فيسمعها في رغبة ونهامة واجلال ويحب إحياءها ونشرها ومذاكرتها وكان ابن أخيه المحدث الكبير الشيخ محمد زكريا الكاندهلوي (صاحب أوجز المسالك إلى موطأ الإمام مالك) الف كتاباً متوسطاً في "أردو" في أخبار الصحابة رضي الله عنهم سماه حكايات الصحابة وسر به الشيخ سروراً عظيماً، وألزم المشتغلين بالدعوة والرحلات في سبيلها مطالعة هذا الكتاب ومدارسته، وكان —ولا يزال— من أهم الكتب المقررة للدعاة والمتطوعين، ومن الكتب التي نالت قبولاً عظيماً ورواجا كبيراً في الأوساط الدينية.

وورث الشيخ محمد يوسف والده العظيم الشيخ محمد إلياس... ولا نعرف —فيمن نعرف— أوسع نظراً في أخبارهم، ودقائق أحوالهم، وأكثر استحضاراً لها، وأحسن استشهاداً بها، وأجمل اقتباساً منها، وأكثر إيراداً لها في الحديث والمحاضرات منه، وتكاد تكون هذه الحكايات التاريخية والقصص الحق مصدر قوة كلامه وتأثيره وسر سحره ووقعه

في القلوب وحمل الجماعات الكبيرة على التضحية والإيثار، والاستهانة بالمتاعب والمصائب، وتكبد المشاق في سبيل الله........

وقد خالط حب الصحابة لحمه ودمه، واستولى على مشاعره وتفكيره، وقد عاش في أخبارهم وأحاديثهم زمنا طويلا، ولا يزال يعيش فيها، ويستقي من منابعها، فسح الله في مدته وبارك في حياته۔

ترجمہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت اور تاریخ اس قوت ایمانی اور جوش اسلامی کے طاقتور ترین سرچشموں میں سے ہے جس کو امت مسلمہ نے دل کی انگیٹھیوں کو سلگانے اور دعوت ایمان کے شعلہ کو تیز تر کرنے میں استعمال کیا ہے، جو مادیت کی تیز وتند آندھیوں سے بار بار سرد ہو جاتی ہیں، اور اگر یہ انگیٹھیاں سرد ہو جائیں تو ملت اسلامیہ کے پاس قوت وتاثیر اور امتیاز کا سرمایہ نہ رہے اور یہ لاشئہ بے جان ہو کر رہ جائے جس کو زندگی اپنے کاندھوں پر اٹھائے پھر رہی ہو۔

لیکن مسلمانوں پر ایک ایسا وقت بھی آیا جب وہ اس تاریخ سے بیگانہ ہو کر اس کو فراموش کر بیٹھے ہمارے اہل وعظ و ارشاد اور اہل قلم ومصنفین نے اپنی تمام تر توجہ اولیاء متاخرین کے واقعات اور ارباب زہد ومشیخت کی حکایات بیان کرنے پر صرف کر دی اور لوگ بھی اس پر ایسے فریفتہ ہوے کہ وعظ وارشاد کی مجالس درس وتدریس کے حلقے اور اس دور کی ساری تصانیف اور کتابیں انہیں واقعات سے بھر گئیں اور سارا علمی سرمایہ صوفیائے کرام کے احوال وکرامات کی نذر ہو گیا۔

جہاں تک راقم السطور کو علم ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات وحالات

کا اسلامی دعوت وتربیت میں مقام اور اس گنج گراں مایہ کی اصلاح وتربیت کے میدان میں اہمیت، تاثیر کی افادیت اور قدر و قیمت کی جانب پہلی بار مشہور داعی الی اللہ مصلح کبیر حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۳۶۳ھ) کی توجہ ہوئی جو پوری ہمت اور بلند حوصلگی کے ساتھ اس کے مطالعہ میں منہمک ہو گئے، میں نے ان میں سیرت نبوی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات کا بے پناہ شوق پایا، وہ اپنے عقیدت مندوں اور ساتھیوں سے انہیں کی باتیں کرتے اس کا مذاکرہ کرتے چنانچہ ہر شب میں مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعات پڑھ کر سناتے وہ پوری توجہ اور عظمت کے ساتھ ہمہ تن شوق بن کر سنتے تھے اور چاہتے تھے کہ ان کی نشر و اشاعت کی جائے، ان کے بھتیجے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک متوسط رسالہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں تالیف کیا جس سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت مسرور ہوے اور تمام کام کرنے والوں اور دعوت کے راستہ میں نکلنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ومذاکرہ ضروری قرار دیا چنانچہ یہ کتاب دعوت کے کام کرنے والوں کے نصاب میں داخل ہے اور دینی حلقوں میں اس کو ایسا قبول عام حاصل ہے جو کم کتابوں کو حاصل ہوا ہوگا۔

حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے عظیم المرتبت والد کے جانشین اور وارث ہوے..... چنانچہ جن لوگوں کو میں جانتا ہوں، ان میں مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا صحابہ کے حالات پر نظر رکھنے والا، ان سے زیادہ استحضار رکھنے والا، ان سے اچھا استشہاد کرنے والا، اپنی

تقریروں اور گفتگو میں ان کے واقعات کو نگینے کی طرح جڑنے والا وسیع النظر اور باریک بین عالم میں نے نہیں دیکھا، قریب قریب یہی سب واقعات اور سچے قصے ان کی قوت کلام کا سرچشمہ، ان کی اثر انگیزی اور سحر آفرینی کا ذریعہ تھے، جماعتوں کو بڑی سے بڑی قربانی دینے، بڑے سے بڑے ایثار کے لیے تیار کرنے، سخت سے سخت تکلیفیں جھیلنے اور بڑی سے بڑی مصیبت اٹھانے اور دعوت کے راستے میں سختیاں برداشت کرنے کا بہت بڑا ہتھیار تھے.... چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت ان کے رگ وریشے میں داخل ہوگئی ہے، ان کے دل ودماغ پر چھا گئی ہے، اور ان ہی کے واقعات وقصوں میں ان کی زندگی کا ایک لمبا زمانہ گزرا ہے، آج بھی وہ اسی میں جی رہے ہیں اور ان ہی چشموں سے سیراب ہو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی عمر کو دراز فرمائے، ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے''۔

اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ نے حیاۃ الصحابہ کی تقریظ میں لکھا ہے:

فما ترك شاذة ولا فاذة. صغيرة أو كبيرة من حياة الصحابة إلا ذكرها وأدخلها في بابها فصار الكتاب بحر السيرة العطرة لخير القرون الثلثة الخيرة فجزاه الله خيرا عن الإسلام والمسلمين. اهـ

ترجمہ: چنانچہ حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صحابہ کی زندگی کی کوئی بھولی بسری، چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑی جس کا تذکرہ اس کے باب میں نہ کردیا ہو، چنانچہ کتاب حیاۃ الصحابہ خیر القرون کی معطر سیرت کا سمندر بن گئی، اللہ پاک اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

محشی حیاۃ الصحابہ حضرت مولانا الیاس بارہ بنکوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے مقدمہ میں لکھا ہے:

سمعت بعض العلماء أنه قد طلب من الداعية الشيخ محمد يوسف رحمه الله تعالى ان يؤلف كتابا في أصول الدعوة والتبليغ ، فأجاب الشيخ قائلا: إن هذه الدعوة لجميع الامة الاسلامية ولا يجب عليهم ان يقتدوا بي ويتبعوني لأنني لست إلا فردا من افراد هذه الأمة ولكن عليهم ان يقتدوا بهدي النبي صلى الله عليه وسلم في جميع موارده ومصادره وحركاته وسكناته وكذلك عليهم أن يقتدوا بهدي اصحابه رضي الله عنهم الذين قاموا باتباع ما ورد عن الرسول صلى الله عليه وسلم في هذه الدعوة وغيرها بصفه تامة فقام بجمع احوال الصحابة رضي الله عنهم وذلك في ضوء ما ورد عن الرسول صلى الله عليه وسلم من احاديث واثار بهذا الخصوص واضاف قائلا انني قمت بجمع احوالهم في هذا الكتاب فعلى الأمة الإسلامية أن تقرأ وتستنبط أصول الدعوه منها وتتمسك بهدي النبي صلى الله عليه وسلم في هذه الدعوة۔اھ۔

ترجمہ: ہم نے بعض علماء سے سنا ہے کہ حضرت مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی گئی کہ آپ اصول دعوت وتبلیغ میں کوئی کتاب لکھ دیں؛ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا کہ: یہ کام پوری امت کا ہے، اور امت کے ذمہ میری اقتدا و اتباع لازم نہیں ہے، میں تو محض ایک فرد ہوں، ہاں امت کے ذمہ ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اتباع

کریں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روزمرہ کے تمام حالات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حرکات وسکنات میں، اسی طرح امت کے ذمہ لازم ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان اصحاب کی سیرت کا اتباع جنہوں نے دعوت کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر طرح سے کامل اتباع کیا ہے، چنانچہ حضرت مولانا یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے تمام احوال کو احادیث وآثار کی روشنی میں جمع کر دیا اور مزید یہ فرمایا کہ میں نے اپنی اس کتاب (حیاۃ الصحابہ) میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے تمام احوال کو جمع کر دیا ہے اب امت کو چاہیے کہ اس کتاب کو پڑھیں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت سے اصول دعوت کو لیں اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو مضبوط پکڑیں۔

نیز مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری جگہ حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا نے قرن اول کے مسلمانوں کے طریق زندگی کا بڑی غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا، آخر وقت تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات وسیر اور اخلاق وشمائل کا مذاکرہ اور دور رہا اور ان کے حالات پڑھوا کر سنتے رہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خصائص وامتیازات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور جزئیات پر جتنی عمیق نظر تھی اس وقت تک کہیں دیکھنے میں نہیں آئی، مولانا کا اصلی درد یہی تھا کہ اسی طرز زندگی اور اسی طریق ذکر وتعلم کو زندہ کیا جائے۔اھ''(۱)

مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بیان میں فرمایا: حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے صرف فارغ ہوتے ہی اس طرح کام شروع نہیں کیا تھا بلکہ حضرت نے پہلے تمام تاریخ کا اور تمام تحریکات کا مطالعہ کیا تھا اور پھر قرآن وحدیث کو بار بار پڑھ کر اس کا ماخذ

(۱) تعلیم وتعلم ص:۲۱، دینی دعوت ص:۲۹۰

تلاش کیا اور بہت غور وخوض کے بعد قرآن وحدیث سے مطابقت کرتے ہوے اس کام کو شروع کیا، اور پھر جب اس کی تائید حاصل ہو جاتی تب کہتے کہ اب بات ٹھیک ہوئی اس طرح اس تبلیغ کا کام شروع ہوا، اور پھر ہم سے کہا کہ اب اس تبلیغ کو سیکھو۔(۱)

ایک دوسرے بیان میں فرمایا: اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ مولانا الیاس صاحب نے اس دعوت والے کام کو قرآن کی نظر سے دیکھا قرآن کو دعوت ایمان کی نظر سے دیکھا، دیکھنا شروع کیا ایمان کی دعوت کے احوال کو مستقل پڑھنا شروع کیا اور سب سے زیادہ جو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتیں ہیں ابن کثیر میں آئی ہیں، ابن جریر میں آئی ہیں ان سیرتوں کو سبقا سبقا پڑھا اور سنا اور اس میں سے اصول وآداب اخذ کیے، اور اس میں کون منسوخ ہو گیا ہے؟ اس پر غور کرنا اور کون آگے چلا اس کو دیکھنا، اور اس میں کون ایسا ہے جو وقتی طور پر ہے کہ پہلے اسے لے لو پھر آگے اسے چھوڑ دو، تمام اصول وآداب پر غور شروع کر دیا، روزانہ کئی گھنٹے اس پر لگاتے تھے، اور قرآن کو پڑھنا شروع کیا اس نیت سے کہ یہ دعوت کی کتاب ہے، لہٰذا اس کو دیکھو کہ اس میں دعوت کے کام کے اصول کیا بیان کیے گئے ہیں، مہینوں اور سالوں اس میں لگ گئے اور اس میں غور کیا۔(۲)

نیز ایک تیسرے بیان میں ایک موقع پر فرمایا: اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کو غور سے پڑھو گے اور دیکھو گے اس طرح کہ پہلے مکی سورتوں کو دیکھا جائے پھر مدنی سورتوں کے اجزاء کو دیکھا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ابتداء میں کونسی؟ تو پھر جو کہہ رہا ہوں اس پر اشکال نہ ہوگا، اگر امت کی اصلاح کوئی کرنا چاہے تو اسے وہی کرنا پڑے گا جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے کیا تھا، حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس امت کے بگاڑ کو دور کرنا ہے تو وہی کرنا پڑے گا جس کو صحابہ کرام نے پہلے کیا تھا اور جس ترتیب سے کیا اس ترتیب سے کام شروع کرے۔(۳)

---

(۱) مواعظ عبیدیہ:۲/۷۷ (۲) مواعظ عبیدیہ:۲/۱۸۰
(۳) مواعظ عبیدیہ:۲/۲۰۲

نیز مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: وہ عمومی طریقہ جس سے پوری امت کے تمام طبقات میں علم عام ہوتا چلا جائے اور ہر شخص قیامت کے میدان میں کامیاب ہو سکے وہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سیرت پر غور وفکر کرنے سے سمجھ میں آجائے گا، ان میں علم ضروری کس طرح سے عام تھا، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں علم کو عام کرنے کا جو طریقہ اختیار فرمایا وہ طریقہ اصل ہے، اس طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے استنباطی طریقے سے علم عام نہیں ہو سکتا، جیسا کہ اس زمانے میں اصل طریقہ باقی نہ رہا، فقط استنباطی طریقے سے سکھایا جارہا ہے۔(۱)

حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: آخر کب تک ان اصطلاحی اور رسمی علوم میں دل ودماغ اور اعضائے رئیسہ کو کھپایئے گا، کیا قرآن حکیم اسی واسطے اتارا گیا ہے؟ کیا پیغمبر اس کے لیے بھیجے گئے ہیں، روح اور قلب کو محبوب حقیقی کی محبت اور تعظیم سے رنگیے۔ اور اس کی یاد میں رنگین کیجیے، عمر کا بہت بڑا حصہ ان رسمیات میں گزر چکا ہے، یہ وسائل ہیں مقاصد نہیں ہیں، کب تک ان رسوم میں جو کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں نہیں تھیں، عمر کو ضائع کیجئے گا۔(۲)

اکابر وسلف کے ان تمام اقوال کی روشنی میں آپ خود بتایئے کہ سیرت سیرت کا نعرہ لگانا اپنے اکابر وسلف کا اتباع ہے یا اس پر تنقید کرنا؟

عجیب متضاد مطالبے ہیں ایک طرف یہ کہ اپنے اکابر وسلف کی اتباع کرو دوسری طرف یہ کہ سیرت سیرت کا نعرہ مت لگاؤ، شخص مذکور کے دادا، پردادا اور دیگر اکابر دیوبند کی زندگی تو یہی نعرہ لگاتے لگاتے گزری ہے، اور یہ کام تو مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بقول قرن اول کا ہیرا ہے اس میں سیرت سے ہٹ کر جائیں گے کہاں؟ فرقہ ناجیہ کی تو علامت ہی "ما أنا علیه و أصحابي" ہے، اس میں تو جتنی کوشش کی جائے کم ہے جتنی ترغیب دی جائے

(۱) تعلیم وتعلم ص:۲۷، مکاتیب:۲/۲۰۴

(۲) مکتوبات شیخ الاسلام-۲/۱۸۵

کم ہے کیونکہ اس کام کی روح اور اس کام کے عرب وعجم میں مقبول ہونے کی اصل بنیاد بھی یہی ہے اور بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جب سے یہ چیز امت سے نکلی ہے امت جسد بے روح کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔

کسی سنت طریقہ کو زندہ کرنے کی کوشش میں اگر کوئی ایسی بات کہتا ہے جو عوام کو اس سنت طریقے کو بھول جانے کی وجہ سے عجیب وغریب لگتی ہے تو اس پر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: الإسلام بدأ غريبا وسيعود كما بدأ فطوبي للغرباء الذين يصلحون ما افسد الناس من بعدي من سنتي'' زیادہ منطبق ہوتی ہے یا تحریر مذکور میں ابن قتیبہ سے نقل کردہ یہ قول کہ''عوام اپنی ناواقفیت کی وجہ سے ایسے مقرر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس کی تقریر میں عام معمول سے ہٹ کر عجیب وغریب اور نئی نئی قسم کی باتیں ملتی ہوں'' مقصد یہ ہے کہ ابن قتیبہ کی بات جب منطبق ہوتی جب سنت وسیرت سے ہٹ کر کوئی بات کی جاتی۔

(و) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعلیمی وتربیتی نظام کے پوری طرح مسجد سے مربوط ہونے کی بات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، گویا کہ یہ بات بھی اکابر وسلف سے ہٹ کر کوئی نئی بات ہے

مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے جمع کردہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات جن کے پڑھنے کی حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ بہت تاکید فرماتے تھے، اس میں ہے: مسجدیں مسجد نبوی کی بیٹیاں ہیں، اس لیے ان میں وہ سب کام ہونے چاہئیں، جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں ہوتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد میں نماز کے علاوہ تعلیم وتربیت کا کام بھی ہوتا تھا اور دین کی دعوت کے سلسلہ کے سب کام بھی مسجد ہی سے ہوتے تھے، دین کی تبلیغ وتعلیم کے لیے وفود کی روانگی بھی مسجد ہی سے ہوتی تھی، یہاں تک کہ عساکر کا نظم بھی مسجد ہی سے ہوتا تھا، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری مسجدوں میں بھی اسی طریقہ پر یہ سب کام ہونے لگیں۔(۱)

(۱) ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس-ملفوظ نمبر:۲۰۷

نیز فرمایا: دین کی عمومی تعلیم وتربیت کا جو طریقہ ہم اپنی اس تحریک کے ذریعہ رائج کرنا چاہتے ہیں صرف وہی طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رائج تھا اور اسی طرز سے وہاں عام طور پر دین سیکھا اور سکھایا جاتا تھا بعد میں جو اور طریقے اس سلسلہ میں ایجاد ہوئے، مثلا: تصنیف وتالیف اور کتابی تعلیم وغیرہ سو ان کو ضرورت حادثہ نے پیدا کیا مگر اب لوگوں نے صرف اسی کو اصل سمجھ لیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کے طریقہ کو بالکل بھلا دیا، حالانکہ اصل طریقہ وہی ہے اور عمومی پیمانہ پر تعلیم وتربیت صرف اسی طریقہ سے دی جاسکتی ہے۔(۱)

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس آخری جملے کی شرح مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے درج ذیل بیان سے ہوتی ہے: نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہی طریقہ تھا، جب نئی وحی نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وحی کے نازل ہوتے ہی صحیفوں میں لکھوا دیتے تھے، اور جو پہلی نماز آتی تھی اس نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوکر جو نیا قرآن اترا ہے وہ قرآن لوگوں کو پڑھ کر سناتے تھے، اور ایک مرتبہ نہیں، ایک، دو تین، چار، تو جو ذہین حضرات ہوتے تھے ان کو یاد ہوجاتی تھی، پھر اس کے بعد حلقے بنتے تھے، بھر جس کو یاد ہوئی ہے وہ دوسروں کو بار بار کہہ کر کے یاد کرا دیتے تھے....اب یہ اپنے گھر جاتے تھے، گھر جاکر اپنے کاموں میں مشغول نہیں ہوتے تھے، ہر ایک کو یہ حکم تھا کہ جتنا تم نے یاد کیا ہے دوسرے مسلمانوں کو پہنچاؤ، بخاری میں حدیث ہے: ''بلغوا عني ولو آية'' میری طرف سے پہنچاؤ چاہے تم نے ایک آیت یاد کی ہو، سارا قران یاد نہیں ہوا، جتنا، نازل ہوا، ایک ہی آیت یاد ہوئی ہو، اسی کو پہنچاؤ، چنانچہ صبح کو وحی نازل ہوئی تو شام ہوتے ہوتے مدینہ کے ایک ایک فرد تک وہ نئی وحی پہنچ جاتی تھی، ایک ایک مرد تک پہنچ جاتی تھی، ایک ایک عورت تک پہنچ جاتی تھی۔(۲)

مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں ہے: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر امتی کو

(۱) ملفوظات حضرت مولانا محمد الیاس-ملفوظ نمبر: ۸۴

(۲) https://bit.ly/47BRvl9

مسجد والا بنایا تھا، مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دیے تھے، ان اعمال سے مسلمانوں کا زندگی میں امتیاز تھا، مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں، اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں، عملوں کے ٹھیک کرنے کے لیے تعلیمیں ہوتی تھیں، ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لیے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد سے ہی ہوتی تھیں، اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں، یہاں تعاون ایثار اور ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے، ہر شخص، حاکم، محکوم، مالدار، غریب، تاجر، زارع، مزدور مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا اور باہر جاکر اپنے اپنے شعبے میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا، آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے مسجدیں اعمال سے خالی ہوگئیں اور چیزوں سے بھر گئیں، حضور ﷺ نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا، حضور ﷺ کی مسجد میں نہ بجلی تھی نہ پانی تھا، نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی مسجد میں آکر داعی بنتا تھا معلم اور متعلم بنتا تھا، ذاکر بنتا تھا نمازی بنتا تھا مطیع بنتا تھا، متقی زاہد بنتا تھا، خلیق بنتا تھا، باہر جاکر ٹھیک زندگی گزارتا تھا مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی، ان چار ماہ میں ہر جگہ جاکر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لیے تین چلوں کے واسطے آمادہ کریں۔(۱)

دور نبوت کے تعلیمی نظام کو مساجد سے پوری طرح مربوط ظاہر کرنے کے لیے حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حیاۃ الصحابہ جلد ثالث میں باقاعدہ عنوان قائم فرمایا: "لماذا بنیت المساجد و ماذا کانوا یفعلون فیھا"۔

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں: حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مدرسہ میں جو تعلیم ہو رہی ہے بیشک اس سے فرض کفایہ ادا ہو رہا ہے لیکن فرض عین جو اس علم کا ہے وہ پورا نہیں ہو رہا ہے اور جو مسجدوں میں ہر مرد کو تیار ہونا چاہیے تھا، جو تعلیم دین فرض تھی وہ مسجدوں کی تعلیم بند ہو چکی ہے۔(۲)

---

(۱) سوانح یوسفی ص:۷۷۱

(۲) مواعظ عبیدیہ ۲/۱۶۶

ایک بیان میں فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد بنائی تا کہ سب کام اجتماعی ہوں۔۔۔ اب جہاں بھی مسجدیں بن رہی ہیں خواہ قبا میں یا کہیں بھی حلقہ ایمان، حلقہ عبادت، حلقہ ذکر ہو رہا ہے، اب جو بھی ایمان لاتا تھا ان سب کو حلقہ ایمان، حلقہ ذکر، حلقہ دعوت سب کام میں جوڑا جاتا تھا، تعلیم کے لیے اصحاب صفہ کے لیے صفہ کی جگہ متعین کی گئی، اُس زمانہ میں تعلیم کے لیے ہمارے زمانے میں جس طرح دار العلوم یا مدرسہ ڈھابیل کی طرح عمارت کا نظام نہیں تھا لیکن مسجد میں ایک حصہ تھا اس میں علم حاصل کرنے والوں کا مجمع تھا اس میں بڑی قربانی والا ماحول تھا ایسے کمرے نہیں تھے جیسے مدرسہ ڈابھیل میں ہیں، میں ایسے انتظامات کا مخالف نہیں ہوں یہ انتظامات آج ضروری ہیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ کا مدرسہ جو تھا اس میں یہ سہولت نہ تھی۔(۱)

حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: میں اس وقت عربی مدارس کی افادیت کا اتنا قائل نہیں ہوں کہ قصبے قصبے میں ہوں اور ہر جگہ دورہ ہو، اور ہر جگہ بخاری شریف ضرور ختم ہو، لیکن ان مکاتب کی ضرورت زیادہ ہے یعنی مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف اور حلال وحرام اور اس سے بڑھ کر کفر وایمان اور توحید وشرک، ان کا امتیاز ان کو ہو جائے ہم آپ یہاں بیٹھے ہوے ہیں، اور تیزی کے ساتھ ہندوستان بدل رہا ہے، ہر چیز کو نیشنلائز کیا جا رہا ہے، یونیورسٹیوں کی باری آ گئی، مسلم یونیورسٹی کی باری آ گئی، کل مدارس کی باری آ سکتی ہے، تو اس کے لیے مکاتب کا جال بچھا دیجئے، اور مساجد کو مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بنائیے، سب سے آخر میں انقلاب کے قدم جہاں پر پہونچیں گے وہ مسجدیں ہیں، اس کے لیے آپ ایسی جگہ اپنے مرکز بنائیے، جہاں دیر میں انقلاب پہونچے یا وہاں تک انقلاب پہونچتے پہونچتے قیامت آ جائے ممکن ہے موقع ہی نہ ملے تو آپ مساجد کو مرکز بنائیے، اور کثرت سے مکاتب قائم کیجیے، اور بالکل اس کی پرواہ نہ کیجیے کہ آپ نے مدرسہ میں یہ پڑھا تھا، وہ پڑھا تھا، اور وہ علوم ومعارف اور حقائق پڑھے تھے، اور اب یہاں بچوں

---

(۱) مواعظ عبیدیہ: ۲/۱۴۸-۱۴۹

کو پڑھا رہے ہیں، دیہاتیوں سے باتیں کررہے ہیں، آپ نے علم ضائع کیا کبھی اس کا خیال نہ کیجئے مقصود اللہ تعالی کی رضا ہے، اور اسلام کا تحفظ۔(۱)

نیز مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:

''مساجد بجا طور پر مسلمانوں کا دینی مرکز اوران کی تعلیم وتربیت اوراصلاح و رہنمائی کا سرچشمہ بن گئی تھیں ان میں مسلمانوں کے اجتماعی ودینی معالات حل کیے جاتے تھے زندگی کے مختلف شعبوں اورمختلف مہموں میں ان کو احکام دیے جاتے تھے جب کوئی بڑا واقعہ پیش آتا یا کوئی مہم درپیش ہوتی اور مسلمانوں کو کوئی ہدایت اورنئی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ وآلہ وسلم حکم دیتے مسلمانوں میں اعلان کردیا جائے الصلوۃ جامعۃ، (یعنی دوسرے محلوں اور دور دور کے مسلمان بھی آج نماز مسجد نبوی میں پڑھیں کہ کوئی اہم بات کہنی ہے) مسجدوں کو یہ مرکزیت وجامعیت برابر حاصل رہی ساری زندگی اسی محور کے گرد گھومتی تھی، علم وہدایت کے سرچشمے، اصلاح وارشاد کی تحریکیں، جہاد وسرفروشی کی لہریں سب اسی مرکز سے پیدا ہوتی اور پھیلتی تھیں، آج بھی ان مساجد میں وہ پرانے اثرات باقی ہیں جن پر غیر مسلموں اورغیر مذاہب کے پیروؤں کو حسد ہوتا ہے کبھی وہ ان کو حسرت کے ساتھ دیکھتے ہیں کبھی ڈر اور خوف کے ساتھ، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان مساجد کو مسلم معاشرہ اور مسلم قیادت میں وہ مرکزیت واہمیت دوبارہ حاصل ہو جو پہلے حاصل تھی''۔(۲)

مولانا نورعالم خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) تعلیم وتعلم، ص: ۲۳-۲۴، پاجا سراغِ زندگی، ص: ۱۷۵

(۲) ارکان اربعہ ص: ۷۸

والمساجد محل راحة المسلمين النفسية، فيه تطمئن قلوبهم، وترتاح نفوسهم، وتتزكى نياتهم، وتترقى روحانيتهم وتعلو هممهم وتتقوى عزيمتهم، وتتسامى إرادتهم للعلم والعمل۔ فالنبي ﷺ كان يقول لبلال — رضي الله عنه — عندما يحين وقت الصلاة: "أَرِحْنا بها يا بلال"

والمساجد محل تلاوة القرآن وتدبر أحكام السنة والقيادة والقضاء والتشاور والعلم والتعلم والتخطيط لكل ما يهم الإسلام والمسلمين۔

ولكن كثيراً من الناس في هذا العصر يحاولون الترويج لفكرة أن المؤسسات العلمية، مثل الجامعات والمدارس والمعاهد قد قَلَّصَتْ من دور المساجد، لأنها قد اضطلعت بدورها فأصبحت رسالة المسجد قاصرةً فقط على أداء الصلوات الخمس، والحق أن هذه الفكرة خاطئة۔

فالمساجد أمرها عظيم وتاريخ الدعوة الإسلامية ممتد بإذن الله إلى يوم القيامة، والمسجد سيظل كما كان معقد أرواح المسلمين، ومرجعهم في كل خير۔

كان النبي ﷺ يستقبل فيه الوفود التي تفد إلى مدينة الرسول ﷺ لتتعلم شرائع وأحكام الإسلام وتتفقه في دين الله، وايضا كانت فيه مجالس الشوري بين الرسول ﷺ وأصحابه

وإنه اليوم مثل الأمس من الواجب على المسلمين جميعا أن يهتموا بالمساجد وبدورها وأن يساهموا في عمارتها، لأن عمارتها من أشرف الأعمال، فهي مهمة الأتقياء والصلحاء

في كل زمان۔

والمسلمون الصادقون الصالحون هم الذين يحثون المسلمين على الذهاب إلى المساجد وأداء الصلوات في جماعة، وبيان أن ذلك من علامات الصلاح والتقوى، فقد أخبر الرسول ﷺ أننا إذا رأينا الرجل يرتاد المساجد فلنشهد له بالصلاح، وأنه إذا تطهر الإنسان في بيته ثم ذهب إلى المسجد للصلاة فهو في سبيل الله حتى يرجع، ويثيبه الله على كل خطوة حسنةً، ويمحو بهذه الخطوات الخطايا والذنوب۔

إن المساجد منارات علم وثقافة وعبادة وإدارة عامة لكل شؤون الحياة الممكنة فيها، فالواجب تهيئتها أحسن التهيئة وإعدادها أعظم الإعداد؛ حتى تكون في استقبال المسلمين في جميع مراحل الحياة. وكل هذا يُؤَلِّف بين المسلمين ويُقوي ارتباطهم بالمسجد، ويجعل قلوبهم متعلقة به؛ حتى يكونوا من السبعة الذين يظلهم الله بظله يوم لا ظل إلا ظله۔

وبذلك كله فالمساجد ظل لها دورها الكبير وسيظل في تخريج المسلمين على ما يريده الله تعالى ورسوله ﷺ من الفضائل والمزايا التي تميزهم عن غيرهم من أمم الأرض في المظهر والمخبر. والحاجة ماسة أن يتعلق المسلمون اليوم بالمساجد كما تعلق به سلفهم؛ فلن يصلح آخر هذه الأمة إلا بما صلح به أولها. (١)

---

(١) الداعی-ربیع الاول ۱۴۳۴ھ مطابق جنوری، فروری - ۲۰۱۳ء- المساجد ... دورها في الإسلام ماضيا وحاضرا

ترجمہ: ''مسجدیں مسلمانوں کے روحانی سکون کے وہ مراکز ہیں جہاں جان و دل کو اطمینان اور راحت حاصل ہوتا ہے، نیتوں کو پاکیزگی روحانیت کو ترقی حاصل ہوتی ہے ہمتیں بلند اور عزائم قوی ہوتے ہیں اور علم وعمل کے ارادے بلندیوں کو چھوتے ہیں، نبی پاک ﷺ نمازوں کا وقت آنے پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرماتے:

بلال! نماز کے ذریعہ ہمیں راحت پہنچاؤ۔

مسجدیں تلاوت قرآن، احکام سنت میں غور وفکر، قیادت وقضاء، تعلیم وتعلم اور اسلام ومسلمین کو درپیش مہمات کی تجاویز ومشوروں کی جگہیں ہیں۔

لیکن اس زمانے میں بہت سے لوگ اس فکر کو رواج دینے میں لگے ہوے ہیں کہ جامعات و مدارس اور معاہد جیسے علمی اداروں نے مساجد کے دور کو ختم کر دیا ہے؛ اس لیے کہ وہ اپنے کردار میں مضبوط ہو گئے ہیں؛ لہٰذا مسجدوں کا کام پنجگانہ نمازوں کی ادائیگی میں منحصر ہو کر رہ گیا ہے جب کہ حق یہ ہے کہ یہ سوچ سراسر غلط ہے، اس لیے کہ ہر کار خیر میں مسجدوں کا کردار بہت بڑا تھا، ہے اور رہے گا، دعوت اسلام کی تاریخ اللہ کے حکم سے قیامت تک دراز رہے گی اور مساجد مسلمانوں کی روحوں کا ماویٰ وملجا رہیں گی، جیسا کہ ماضی میں رہی ہیں۔

نبی پاک ﷺ ان وفود کو مسجد میں ٹھہراتے تھے جو شریعت اور احکام اسلام کو سیکھنے اور اللہ کے دین کی سمجھ پیدا کرنے کے لیے مدینہ پاک آتے تھے، مسجدوں ہی میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کے درمیان مشورے ہوتے تھے۔

کل کی طرح آج بھی مسلمانوں کا یہ فریضہ ہے کہ مساجد اور مساجد کے کاموں کا پورا اہتمام کریں اور مساجد کی آبادی میں ایک دوسرے سے

بڑھ چڑھ کر حصہ لیں اس لیے کہ مسجدوں کی آبادی اشرف الاعمال میں سے ہے، چنانچہ ہر زمانہ میں اہل تقویٰ وصلاح کا یہی کام رہا ہے۔

اور نیک بخت سچے مسلمان وہ ہیں جو مسلمانوں کو مسجد آنے کی اور جماعت کی نماز کے اہتمام کی دعوت دیتے ہیں، اور یہ عمل ان کے صلاح اور تقویٰ کی علامت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''کسی کو مسجد میں کثرت سے آتا جاتا دیکھ کر ہم اس کے ایماندار ہونے کی گواہی دیں'' یہ بھی فرمایا: ''جب انسان اپنے گھر سے پاکی حاصل کر کے نماز کے لیے مسجد آتا ہے تو وہ اپنے گھر واپس پہنچنے تک اللہ تعالیٰ کے راستے میں ہوتا ہے'' نیز اللہ تعالیٰ مسجد آنے جانے پر ہر قدم پر نیکیاں عطا فرماتے ہیں اور خطایا اور گناہوں کو مٹا دیتے ہیں۔

مسجدیں علم، تہذیب اور عبادت کے منارے ہیں اور زندگی کے ان تمام معاملات کے ٹھکانے ہیں جو مسجد میں ہو سکتے ہوں، لہٰذا مسجدوں کو اس طرح سے تیار کرنا واجب ہے کہ مسجدیں تمام مراحل زندگی میں مسلمانوں کا ٹھکانہ ہوں، یہ بات مسلمانوں میں باہمی الفت پیدا کرے گی، اور مسلمانوں کے دلوں کو ایسا کر دے گی کہ ان کے دل ہر وقت مسجدوں میں لگے رہیں، تاکہ مسلمان ان سات قسم کے خوش نصیبوں میں ہو جائے جنہیں اللہ تعالیٰ اس دن عرش کا سایہ نصیب فرمائے گا جس دن کوئی سایہ نہ ہوگا۔

بہر حال! مسلمانوں کو ان فضائل و امتیازات کی طرف لانے میں جو مسلمان کو دیگر امتوں سے ماضی و مستقبل میں ممتاز کر دیتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رسول چاہتے ہیں، مساجد کا بڑا کردار رہا ہے اور رہے گا، آج تقاضے اس بات کے متقاضی ہیں کہ مسلمانوں کا ربط

مسجدوں سے ایسا ہی ہو جائے جیسا کہ ان کے سلف کا رہا ہے، اس لیے
کہ اس امت کے آخر کی اصلاح نہیں ہوگی مگر انہی طریقوں کی پیروی
سے جن سے پہلوں کی اصلاح ہوئی ہے۔

نیز مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوت کے میدان میں پھراتے ہوئے علم سکھایا، مسجد کو اس کا مرکز بنایا، یہ دونوں مقام حق تعالیٰ کی تعظیم اور ایمان ویقین کو بڑھاتے ہیں عمل کی طرف کھینچتے ہیں، مسجد میں آدمی وضو کے ساتھ علم لے گا، سکون وقار کے ساتھ بیٹھے گا، ہنسی سے پرہیز کرے گا، دھیان وتوجہ سے رہے گا، نماز اور جماعت کا اہتمام کرے گا، آداب علم، آداب مجلس اور آداب محل کے ساتھ رہے گا اور یہ سب چیزیں تعظیم خداوندی اور تعظیم علم پیدا کرتی ہیں اور علم کی طرف کھینچتی ہیں، حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اسلام کتنا ہی پھیلا ہو، لیکن مسجد ہی علم کا مرکز رہا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضرت علی رضی اللہ عنہ غرض کہ تمام صحابہ کے زمانے میں دائرہ اسلام بڑھتا رہا اور لاکھوں کی تعداد میں انسان اسلام میں داخل ہو چکے تھے لیکن مسجد میں علم دیا جاتا رہا، مسجدوں کی توسیع ضروری ہوتی رہی، غور کرنے سے اس میں علم کی عظمت اور علم سے ارتباط اور اللہ سے تعلق معلوم ہوتا ہے، یہ اصل ختم ہو کر استنباطی شکلوں سے علم کا رواج بڑھ گیا۔(۱)

اسی طرح قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسجدوں میں تعلیمی حلقات اور مجالس قائم کی جاتی تھیں، بعض حضرات اپنے مکانوں پر تعلیم دیتے تھے، بعد میں اسی سنت کے مطابق علماء اسلام نے مسجدوں کو تعلیم وتعلم کا مرکز بنایا اور دو تین صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس درمیان میں تعلیم کے لیے یا طلبہ کے لیے کسی مستقل عمارت کا پتہ نہیں چلتا ہے۔(۲)

---

(۱) تعلیم وتعلم ص:۲۷-۲۸، مکاتیب:۲/ ۲۰۴

(۲) خیر القرون کی درسگاہیں: ص:۱۵-۱۶

مسجد کی تعلیم کی افادیت وانفعیت کے سلسلے میں ابن الحاج کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ابن الحاج المدخل میں لکھتے ہیں:

”أخذ الدرس في المسجد أفضل لأجل كثرة الانتفاع بالعلم لمن قصده ومن لم يقصده، بخلاف المدرسة فانه لاياتي اليها الامن قصد العلم او الاستفتاء فاخذه في المدرسة أقل رتبة في الانتشار منه في المسجد“

مسجد میں درس لینا افضل ہے کیونکہ اس میں طلب علم کا قصد کرنے والے اور نہ قصد کرنے والے دونوں کے حق میں زیادہ فائدہ ہے بخلاف مدرسہ کے کہ وہاں صرف علم کا طالب یا استفتاء کرنے والا ہی آئے گا، اس لیے مسجد کے بجائے مدرسہ میں تحصیل علم سے اس کی اشاعت کم ہوگی۔(۱)

مفتی تقی عثمانی صاحب دام مجدہ لکھتے ہیں کہ جس حد تک ممکن ہو تعلیم بالغان کا مرکز مساجد کو قرار دیا جائے۔(۲)

مساجد میں علمی و تعلیمی حلقات کے ذریعے سے علم کی اشاعت کو عمر ابن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ ان سنتوں میں شمار کرتے ہیں جن کو ترک کر کے مردہ کر دیا گیا ہو، ملاحظہ فرمائیں مندرجہ ذیل عبارت:

عِكْرِمَةُ بْنُ عَمَّارٍ قَالَ: سَمِعْتُ كِتَابَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيزِ يَقُولُ: أَمَّا بَعْدُ فأمُر أَهْلَ الْعِلْمِ أَنْ يَنْشُرُوا الْعِلْمَ فِي مَسَاجِدِهِمْ، فَإِنَّ السُّنَّةَ كَانَتْ قَدْ أُمِيتَتْ (۳)

---

(۱) خیر القرون کی درسگاہیں: ۱۸

(۲) ہمارا تعلیمی نظام کیا ہو ص: ۳۱

(۳) المحدث الفاصل بين الراوي والواعی - عقد المجالس فی المساجد، رقم: ۸۳۱

خطیب بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الفقیہ و المتفقہ میں فَضۡلُ تَدۡرِیسِ الۡفِقۡهِ فِي الۡمَسَاجِدِ کا عنوان قائم کر کے اس مسئلہ کو واضح کیا ہے اور اس میں نقل کیا ہے کہ علماء کرام کی مجلسیں صرف مسجد ہی میں لگتی تھیں: ”عن ابی الأحوص قال: ”ادرکنا الناس وما مجالسهم إلا المساجد“۔

مساجد میں ان علمی مجالس کا اہتمام جمعہ کے دن مزید بڑھ جاتا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں کہ ۳۰ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ملاقات ہوئی کہ وہ جمعہ کے دن غسل کر کے مسجد آ کر امام کے خطبہ کے لیے نکلنے تک لوگوں کو تعلیم دیتے رہتے تھے۔(۱)

مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کی نقل کردہ روایت کی روشنی میں قاضی اطہر مبارک پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اسلام میں عام طور سے دینی تعلیم کی مجلسیں مسجدوں میں منعقد ہوا کرتی تھیں، جن میں ہر قسم کے دینی مسائل بیان کیے جاتے تھے، ابوالاحوص مولی بنی لیث کہتے ہیں کہ ہم نے ان علما کو پایا ہے جن کی مجلسیں صرف مسجدوں میں منعقد ہوتی تھیں حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بعض امراء کے نام خاص طور سے لکھا کہ تم اہل علم کو حکم دو کہ وہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں، یہ سنت متروک ہو چکی ہے حضرات مہاجرین رضی اللہ عنہم عام طور سے مسجد نبوی میں بیٹھا کرتے تھے۔(۲)

نیز تحریر فرماتے ہیں: مشہور تابعی معاویہ بن قرہ مزنی بصری کا بیان ہے کہ میں نے اپنے قبیلہ مزینہ کے تیس صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پایا ہے ان میں ہر ایک نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غزوات میں شمشیر وسنان سے دشمنوں کو مارا تھا یا خود زخمی ہوا تھا، جب جمعہ کا دن آتا تو یہ حضرات نہا کر اچھے کپڑے زیب تن کرتے، بہترین خوشبو لگاتے، پھر نماز جمعہ کے لیے مسجد میں آتے اور دو رکعت نماز پڑھتے، اس کے بعد بیٹھ کر علم دین اور سنت کی تعلیم تلقین کرتے یہاں تک کہ امام خطبہ کے لیے نکلتا۔(۳)

---

(۱) الفقیہ و المتفقہ/باب فضل تدریس الفقہ فی المساجد

(۲) تدوین سیر ومغازی ص:۷۱ (۳) تدوین سیر ومغازی ص:۷۳

ہندوستان کے ابتدائی علمی دور کا نقشہ پوری طرح کس قدر مسجد سے مربوط تھا اس کا اندازہ تاریخ دارالعلوم دیو بندص ۷۰ کی مندرجہ ذیل عبارت سے لگایا جا سکتا ہے، ''ابن حوقل جو چوتھی صدی ہجری کا مشہور سیاح گزرا ہے اپنے چشم دید حالات یہ بیان کرتا ہے: بالعموم مسجدوں میں علماء اور فقہاء کا ایک بڑا گروہ مقیم رہتا ہے، ان علماء اور فقہاء سے استفادہ کرنے والوں کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ جس مسجد میں بھی چلے جایئے کھوے سے کھوا چھلتا نظر آئے گا۔اھ (یعنی کثرت ہجوم کی وجہ سے کندھے سے کندھا چھلتا ہوا نظر آئے گا)۔

اب آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ مقرر صاحب کا یہ کہنا کہ: ''دورِ نبوی میں تعلیم وتربیت کا سارا نظام مسجد سے چلتا تھا'' یہ دورِ نبوی کی غلط تصویر امت کے سامنے پیش کرنا ہے یا محرر صاحب کا یہ کہنا کہ ''خیر القرون میں مسجد کے باہر بھی تعلیم اور دعوت کا نظام قائم تھا، مدینہ منورہ میں تعلیم کے لیے مسجد سے باہر باقاعدہ ایک گھر متعین کیا گیا تھا'' اور خود فیصلہ فرمائیں کہ سلف صالحین اور ہمارے اکابر کی تشریحات کا اتباع یا ان سے انحراف ان دونوں میں سے کونسا کام مقرر صاحب نے کیا ہے اور کونسا کام محرر صاحب نے؟

واضح رہے کہ مسجد سے باہر دینی تعلیم کے ثبوت کے جزوی واقعات کا انکار نہیں لیکن اس کی وجہ سے دورِ نبوی میں تعلیم دین کی جو اصل جگہ تھی اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرنا بالکل مناسب نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کی اصل جگہ مسجد نبوی تھی اس کا کون انکار کر سکتا ہے، ذخائر کتب حدیث وتاریخ میں اس کے بے شمار واقعات موجود ہیں، حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بیان میں فرمایا: پورا عرب اور تمام مسجدیں تعلیم کے حلقوں اور دعوت کے جذبوں اور ذکر کے حلقوں سے بھر گیا۔(۱)

اس سلسلے میں اکابر کی متعدد عبارتیں پہلے نقل کی جا چکی ہیں۔

بلکہ اس کی ترغیب وتحریض میں احادیث قولیہ بھی موجود ہیں۔ مثلاً:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

---

(۱) مواعظ عبیدیہ: ۲/۱۲۹

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من سلك طريقا يلتمس فيه علما سهل الله له به طريقا الى الجنة، وما اجتمع قوم في بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله ويتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة وحفتهم الملائكة وذكرهم الله في من عنده". (۱)

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

"خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن في الصفة فقال ايكم يحب ان يغدو كل يوم الى بطحان — او العقيق — فياتي بناقتين كوماوين زهراوين في غير اثم ولا قطع رحم؟ فقلنا: يا رسول الله كلنا يحب ذلك، قال: فلأن يغدو احدكم الى المسجد فيتعلم آيتين من كتاب الله خير له من ناقتين وثلاث خير له من ثلاث واربع خير له من اربع ومن اعدادهن من الابل". (۲)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح حدیث ہے:

"سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: من جاء مسجدي هذا لم ياته الا لخير يتعلمه او يعلمه فهو بمنزلة المجاهد في سبيل الله ومن جاء لغير ذلك فهو بمنزلة الرجل ينظر الى متاع غيره". (۳)

---

(۱) صحیح مسلم اور سنن ابی داؤد وترمذی

(۲) مسلم شریف اور ابوداؤد شریف

(۳) مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم

اسی کے مشابہ قوی سند کے ساتھ حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"ان النبي صلى الله عليه وسلم قال من دخل مسجدي هذا ليتعلم خيرا او ليعلمه كان بمنزلة المجاهد في سبيل الله ومن دخله لغير ذلك من احاديث الناس كان بمنزلة من يرى ما يعجبه وهو شيء لغيره". (۱)

اسی کے ہم معنی قوی سند کے ساتھ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کا یہ اثر منقول ہے:

"مامن رجل يغدو الى المسجد لخير يتعلمه او يعلمه الا كتب الله له اجر مجاهد لا ينقلب الا غانما". (۲)

اور کنز العمال میں ابن زنجویہ کے حوالے سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ اثر بھی منقول ہے:

"عن علي الأزدي قال سألت ابن عباس رضي الله تعالى عنهما عن الجهاد فقال الا أدلك على ما هو خير لك من الجهاد؟ تبني مسجدا تعلم فيه القرآن وسنن النبي صلى الله عليه وسلم والفقه في الدين – وفي رواية – تعلم فيه الفرائض والسنة والفقه في الدين". (۳)

اور صحیح سند سے حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث مروی ہے:

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني (۵۹۱۱)

(۲) مصنف ابن ابی شیبه (۳۵۷۵۹)

(۳) ورواه ابن عبد البر في جامع بيان العلم (۱۶۰) و(۳۲۵) وفيه ليث بن ابي سليم وهو ممن كان اسم الستر والصدق وتعاطي العلم يشمله كما قال مسلم في مقدمة صحيحه (ص:۴)

"قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من غدا إلى المسجد لا يريد الا ليتعلم خيرا او يعلمه كان له اجر معتمر تام العمرة فمن راح الى المسجد لا يريد الا ليتعلم خيرا او يعلمه فله اجر حاج تام الحجة". (۱)

ان تمام احادیث وآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اور تعلیم و تعلم کا آپس میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

یہ وقت مساجد سے باہر تعلیم کو ثابت کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس امر کو سوچنے کا ہے کہ اگر ہم نے تمام مساجد کے اندر دینی تعلیم کا ماحول نہیں بنایا تو امت کا عموم دین کا علم کہاں حاصل کرے گا؟ کیا مساجد کو تعلیم دین سے خالی کرنا امت کو جہالت کے سمندر میں ڈھکیلنا نہیں ہے؟ بھلا سوچیے تو سہی! مساجد کیسی ویران پڑی ہیں کوئی دینی تعلیم دینے والا نہیں کوئی رہبری کرنے والا نہیں اسلام کا صرف نام باقی رہ گیا قران کے صرف نقوش باقی رہ گئے فتنوں کا دور دورہ ہو گیا اخر کون ہے ان فتنوں کا منبع اور مرجع؟ مدارس کا نفع کتنا کم ہو گیا؟ مدارس میں پڑھائے جانے والے اعلی علوم سے انتفاع سے امت کیسی محروم ہو گئی؟ ہر سال کے ہزاروں فارغین میں سے اگر دو چار کو پڑھانے کا موقع مل بھی گیا تو باقی کہاں گئے؟ یہ وقت تو اس امر کی فکر و کوشش کا ہے کہ تمام اہل حق مل جل کر ایک زبان ایک فکر ہو کر مسجد مسجد تعلیم دین کو زندہ کریں تا کہ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے بقول وہ علم زندہ ہو جو فرض عین ہے اور اس علم کا نفع بھی عام اور تام ہو جو مدارس میں فرض کفایہ کے طور پر پڑھایا جا رہا ہے اور مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول آپ کی نافعیت ثابت ہو اور دنیا میں رہنے کا آپ کو حق حاصل ہو اور کوئی ظالم ہاتھ آپ کا بال بیکا نہ کر سکے: "واما ماينفع الناس فيمكث في الارض"۔

(ز) نماز کو مسجد کا ضمنی عمل کہنے پر اعتراض

ہم اس سلسلے میں صرف مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بیان کے

---

(۱) المستدرك للحاكم: (۱/۹۱)

اقتباس کو شخص مذکور کے مذکورہ جملے کے ساتھ ملا کر پیش کرتے ہیں۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دور نبوی میں مسجد کے اندر سیکھنے سکھانے کے ماحول کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''جو ذہین حضرات ہوتے تھے ان کو (وہ وحی) یاد ہو جاتی تھی، پھر اس کے بعد حلقے بنتے تھے، وہ دوسروں کو بار بار کہہ کر کے وحی یاد کراتے تھے، اور جو عورتیں آتی تھیں وہ بھی دین سیکھنے کے لیے آتی تھیں، اور ان کے بھی حلقے بنتے تھے، جو نیا قرآن اترا ہے وہ بھی عورتیں آپس میں مذاکرہ کر کے یاد کرتی تھیں... اس زمانے میں مسجد نبوی میں جو عورتیں آتی تھیں انہی مقاصد سے آتی تھیں، ان میں جو بنیادی مقصد تھا وہ یہ تھا''۔ ''میری بات غور سے سنو، نماز مسجد کا ضمنی عمل ہے، نماز مسجد کا ضمنی عمل ہے، نماز مسجد کا ضمنی عمل ہے'' اس میں صرف آخری جملہ شخص مذکور کا ہے، باقی مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہیں۔(۱)

اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ تعبیر میں چاہے فرق ہو لیکن مقصد دونوں کا ایک ہی ہے کہ مسجد کو نماز کے لیے خاص کرنا ٹھیک نہیں بلکہ مسجد کا بنیادی مقصد تعلیم و تعلم ہے۔

ویسے پچھلے عنوان کے جملہ مشمولات سے اور خاص طور پر مولانا نور عالم خلیل امینی رحمۃ اللہ علیہ کے قول ''فأصبحت رسالة المسجد قاصرة فقط علي أداء الصلوات الخمس، والحق أن هذه الفكرة خاطئة'' سے اس اعتراض کی پوری حقیقت خود ہی واضح ہو چکی ہے۔

(ح) اور اس بات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا کہ ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں جانتے تھے کہ اجرت اور اجر کیسے جمع کیا جا سکتا ہے''۔

حالاں کہ مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بیان میں فرمایا کہ سارے کام اجرت پر نہیں بلکہ سب کے سب اخلاص پر اور بغیر اجرت کے کام کرتے تھے یہاں تک کہ

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں بیان مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ: https://bit.ly/47BRvl9 اور مذکورہ تحریر کا صفحہ: ۱۲

ان کے ذہنوں میں یہ بیٹھا ہوا تھا کہ جو بھی اجرت پر جہاد کے لیے جارہا ہے تو اس کو اجرت کا وعدہ ہے لیکن اس کو اس کا ثواب نہیں ہے۔(۱)

اسی طرح علامہ حلبی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

ولكن ذلك الثواب اذا لم يأخذ على الأذان أجرا وفى الخلاصة ولا يحل للمؤذن ولا للامام ان يأخذا على الأذان والامامة أجرا فان لم يشارطهم على شيء لكنهم عرفوا حاجته فجمعوا له في كل وقت شيئا كان حسنا يطيب له ولا يكون اجرا۔ انتهى۔(۲)

یعنی اگر طے کر کے اجرت لے لی تو پھر اجر نہیں ملے گا۔ ہاں اگر بغیر طے کیے لوگوں نے اپنی خوشی سے کچھ دے دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ یہ اجرت نہیں۔

خود آپ کی تحریر میں صفحہ:۲۱ میں منح کے حوالے سے نقل کیا گیا:

لكل قارئ في كل سنة مأتا دينار او الفا درهم ان اخذها في الدنيا وإلا اخذها في الآخرة۔ كذا قيل في مآل الفتاوي ايضا۔اھ۔

ترجمہ: ہر قاری کو ہر سال میں اگر دنیا میں بدلہ لینا چاہے تو دوسو دینار یا دو ہزار درہم ملیں گے، اور اگر دنیا میں نہ لے تو آخرت میں ملے گا۔

(۱) مواعظ عبیدیہ:۲/۲۰۹

(۲) الشرح الکبیر للحلبی، ص:۳۸۱

(۳)
شخص مذکور پر محرر کی طرف سے بتکلف اعتراضات

اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ شخص مذکور کی ایسی باتوں کو بتکلف قابل اعتراض بنادیا گیا جن کو اگر کوئی شخص خالی الذہنی کے ساتھ پڑھے تو ادنیٰ اشکال بھی اس میں نہیں ہوتا، یہ چیز سنجیدہ غیر جانبدار معتدل علماء کی شان کے بالکل مناسب نہیں اور اس پر طرہ یہ کہ ایک مومن کی بات کا خود تو کیا صحیح محمل بتاتے، اگر کوئی اور بھی اس کا صحیح محمل بتائے تو اس کو تاویل سے تعبیر کر کے اس کے طرز عمل کو افسوسناک بتایا جائے اور اس کو عنداللہ جواب دہی کی دھمکی دی جائے۔

مثال کے طور پر:

(الف) سلیمان علیہ السلام کا قصہ لے لیجئے اس میں نقل کردہ مجموعی کلام سے تنقیص کا شائبہ تک نہیں ہوتا لیکن اس کے الگ الگ اجزاء کو ایک دوسرے سے جوڑ کر نبی علیہ السلام کی شان کے نامناسب قرار دیا گیا اور یہاں تک کہہ دیا گیا کہ وہ یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں نبی سے غلطی ہوگئی ان کی پیروی نہیں کی جائے گی۔

خود ہی سوچیے جب کفار بنے ہوے سے متاثر ہوتے ہیں اور مسلمان بنانے والے سے متاثر ہوتے ہیں، تو سلیمان علیہ السلام کا یہ سوچنا ''اللہ نے بنایا اللہ نے کیسے بنایا، اللہ نے ایسے بنایا'' یہ بنانے والے کا تاثر ہے یا بنے ہوے کا؟ واضح رہے کہ تاثر عارضی وقتی کافروں کا عمل نہیں ہے بلکہ تاثر دائمی استقلالی کافروں کا عمل ہے، جب کہ شخص مذکور کا حضرت سلیمان علیہ السّلام کے

بارے میں قول ''مجھے نہیں چاہیے گھوڑے مجھے آج کی عصر چاہیے'' یہ دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ آپ کا تاثر دائمی نہیں تھا، البتہ کاملین کو تاثر وقتی پر بھی غم ہوتا ہے تب ہی تو فرمایا: انی أحببت حُبَّ الْخَيْرِ عَن ذِكْرِ رَبِّي حَتَّى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ رُدُّوهَا عَلَيَّ فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوقِ وَالْأَعْنَاقِ۔ اب آپ بیان کے مذکورہ اقتباس کو دوبارہ پڑھ کر خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ تنقیص پر دلالت کرتا ہے یا تعریف پر۔

(ب) اسی طرح سے شخص مذکور کے قول ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تجارت کیوں مخل ہوگی، یہ کام (خلافت) بھی کریں گے تجارت بھی کریں گے'' اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ''یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف ایک غلط نسبت ہے جس کا موصوف نے ارتکاب کیا ہے اور یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے بلکہ اپنے ایجاد کردہ مبتدع احکام پر استدلال کرتے ہوے احادیث وآثار اور واقعات سیرت میں موصوف اپنی طرف سے اس طرح کا تصرف واضافہ کرتے رہتے ہیں''(۱)

حالاں کہ اسی تحریر کے ص: ۴ اور ص: ۱۸ پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ قول بیہقی کی روایت سے نقل کیا گیا ''**سبحن الله يشغلني عن عيالي**'' آپ خود غور فرمائیں کہ اس جملہ کے حاصل مطلب کے لیے اس مذکورہ بالا تعبیر سے اچھی کوئی تعبیر ہوسکتی ہے جس کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور غلط نسبت کے ارتکاب کا الزام لگایا گیا اور اس کو موصوف کی عادت قرار دیا گیا، کیا آپ کے نزدیک کسی اثر میں بھی لفظی ترجمہ سے زیادہ جائز نہیں ہے؟ حالاں کہ جمہور امت کا مذہب حدیث نبوی میں بھی روایت بالمعنی کے جواز کا ہے جن کو جوامع الکلم عطا کیے گئے تھے، بھلا سوچیے تو سہی کہ ''سبحان اللہ کیا خلافت کی مشغولی مجھے اپنے اہل وعیال کے لیے کمانے سے روک سکتی ہے؟'' اور ''تجارت کیوں مخل ہوگی خلافت بھی کریں گے تجارت بھی کریں گے'' ان دونوں جملوں میں کوئی معنوی فرق ہے؟ اور یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ شخص مذکور کوئی تصنیف نہیں کر رہا یا کوئی مضمون تیار نہیں کر رہا ہے کہ جس کی ایک ایک نوک پلک ٹھیک کی جاتی ہے وہ تو مجمع میں بیان

(۱) دیکھیے مذکورہ تحریر میں صفحہ: ۱۴

کرر ہاہے تو کیا بیان کرنے والے کے ایک ایک لفظ کی اس طرح سے پکڑ دھکڑ مناسب ہے؟

اب غور کرنے کی بات ہے کہ موصوف کی قابل اعتراض باتوں میں سے جن دو باتوں کو بطور مثال کے پیش کرنے کے لیے منتخب کیا گیا جب ان کا یہ حال ہے تو ان باتوں کا کیا حال ہوگا جن کی طرف صرف مبہم طور پر اشارہ کیا گیا۔ یہاں پہنچ کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات لکھنے پر مجبور ہونا پڑ رہا ہے ''قائل کے قول کا کوئی محمل صحیح نہیں سوچتے، بس مفتی صاحب کو جو بات ناگوار ہوئی فورا کفر کا فتوی لگا دیا، بلکہ بعض اوقات محمل صحیح سمجھ میں بھی آجاتا ہے پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کر کے اپنا غیظ نکالتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ بیچارہ قائل وجہ کفر کا خود انکار کر رہا ہے، اور محمل صحیح کی تصریح کر رہا ہے، مگر جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی۔''(۱)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس ملفوظ کو شخص مذکور کے تیسرے رجوع نامہ کے اس اقتباس کے پس منظر میں پڑھیں: ''دراصل بندہ یہ سمجھتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک میں طاعات پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، لیکن متأخرین نے جو اجازت دی ہے، وہ جس وقت کی تاویل سے دی ہے، لہذا اسکو تعلیم پر اجرت نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن بندہ سے اس مفہوم کے ادا کرنے میں قصور ہوا، اور بات ایسے انداز سے کہدی گئی جس سے علم دین کے مدرسین کے بارے میں یہ عمومی تاثر پیدا ہو گیا کہ انکا اجرت لینا ناجائز ہے۔ اس تاثر سے بھی بندہ واضح الفاظ میں رجوع کرتا ہے۔''

---

(۱) اصلاح انقلاب امت: ۲/۲۲۹

(۴)

جن چیزوں پر تنقید کی گئی ان کا خود ارتکاب

اوراس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس تحریر میں موصوف کی جن چیزوں پر تنقید کی گئی اسی تحریر میں انہی تمام چیزوں کا خود بھی ارتکاب کیا گیا

مثلاً:

(الف) اس تحریر میں موصوف پر کم علمی اور اہلیت نہ ہونے کے باوجود اجتہاد واستنباط پر جسارت اور دور از کار اجتہادات واستنباطات کے الزامات لگائے گئے اور خود نصوص صریحہ کو نظر انداز کر کے غیر متعلق مسائل سے ادنیٰ مناسبت کی بنیاد پر استنباط کی کوشش کی گئی۔

مثال کے طور پر:

❁ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے امور خلافت میں مشغولی کی وجہ سے بیت المال سے وظیفہ قبول کرنے کی بنیاد پر دینی تعلیم پر اجرت کے جواز کو ثابت کیا گیا چنانچہ صفحہ:۱۱ پر حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے وظیفہ قبول کرنے سے استنباط کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''آج بھی جو طالبان علوم نبوت، علماء کرام محدثین اور دینی خدام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور سلف صالحین کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنیوی اسباب معاش کو چھوڑ کر معمولی وظیفے پر علم دین کے تحفظ واشاعت میں زندگیاں کھپا رہے ہیں، یہ بلاشبہ ان کی عزیمت کی بات ہے''

حالانکہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلیفہ کو قیم الیتیم پر قیاس کرتے ہوئے فرمایا:

> **فیأکل آل ابي بکر من هذا المال واحترف للمسلمین فیه۔ قال ابن الاثیر اراد باحترافه للمسلمین نظر في امورهم وتمییز مکاسبهم وارزاقهم وکذا قال البیضاوي: المعنی اکتسب**

للمسلمين في اموالهم بالسعي في مصالحهم ونظم احوالهم،

معلوم ہوا کہ خلیفہ کی نوعیت مسلمانوں کے مکاسب وارزاق واموال کے نظم وضبط اور دیکھ بھال میں مشغولی کی وجہ سے قیم الیتیم کے مشابہ ہوگئی، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے **"اني انزلت نفسي بمنزلة قيم اليتيم"** کی صراحت کی ہے۔(۱)

بلکہ مہلب بن ابی صفرہ رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ **احترف للمسلمين فيه** کا مطلب یہ ہے کہ میں ان کے مال میں تجارت کر کے اپنے وظیفے کے بقدر یا اس سے بھی زیادہ بیت المال میں واپس کر دوں گا حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ یہ مضاربت کی شکل سے ہوسکتا ہے ورنہ پہلا ہی قول اصح ہے۔(۲)

مقرر صاحب نے تو مجاہدہ کے ناقص ہونے ہی کی بات کہی ائمۂ احناف نے تو ناجائز ہی قرار دے دیا ان پر تو اور بھی بڑا اعتراض بنتا ہے کہ ائمۂ احناف کے نزدیک تو نعوذ باللہ حضرات شیخین نے ایک ناجائز کام کا ارتکاب کیا اور صفحہ: ٤ پر تو اس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کا تقریباً اجماع نقل کر دیا گویا کہ مقرر صاحب نے نہیں بلکہ ائمۂ احناف نے اس مسئلہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع کی مخالفت کی ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس پوری تحریر میں اس کی کہیں وضاحت نہیں کی گئی کہ وہ کونسا مسئلہ ہے جو نصوص قطعیہ **(ومن كان فقيرا فليأكل بالمعروف)** اور **(والعاملين عليها)** وغیرہ اور اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم اور حضرات شیخین کے عمل سے ثابت ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور وہ کونسا مسئلہ ہے جس میں حنفیہ وحنابلہ کا مالکیہ وشافعیہ سے اختلاف ہے، ان دونوں مسئلوں میں خود امتیاز تو کیا کرتے سلف کی جن عبارتوں سے اس کی کچھ وضاحت ہو رہی تھی اس کو نہ جانے کیوں حذف کر دیا گیا چنانچہ امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ احکام القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

فإن قيل فما الفرق بين رزق القاضي والعامل وبين أخذ ولي

---

(۱) رواه ابن أبي شيبة (۳۳۵۸۵) وابن سعد في الطبقات (۳/۲۷۶) وسعيد بن منصور (۷۸۸) والطبري في تفسير سورة النساء والبيهقي: ٦/ ۴-۵ و ۳۵۴

(۲) دیکھیے: فتح الباری وعمدۃ القاری (۲۰۷۰)

اليتيم من ماله مقدار الكفاية وبين أخذ الأجرة، قيل له إن الرزق ليس بأجرة لشيء وإنما هو شئ جعله الله له ولكل من قام بشيء من أمور المسلمين ألا ترى أن الفقهاء لهم أخذ الأرزاق ولم يعملوا شيئاً يجوز أخذ الأجرة عليه لأن اشتغالهم بالفتيا وتفقيه الناس فرض ولا جائز لأحد أخذ الأجرة على الفروض والمقاتلة وذريتها يأخذون الأرازق وليست بأجرة وكذلك الخلفاء وقد كان للنبي ﷺ سهم من الخمس والفيء وسهم من الغنيمة إذا حضر القتال وغير جائز لأحد أن يقول أن النبي ﷺ قد كان يأخذ الأجر على شيء مما يقوم به من أمور الدين وكيف يجوز ذلك مع قول الله تعالى ''قل ما أسألكم عليه من أجر وما أنا من المتكلفين'' و''قل لا أسألكم عليه أجراً إلا المودة في القربي'' فثبت بذلك أن الرزق ليس بأجرة ويدلك على هذا أنه قد تجب للفقراء والمساكين والايتام في بيت المال الحقوق ولا يأخذونها بدلا من شيء فأخذ الأجرة للقاضي ولمن قام بشيء من أمور الدين غير جائز.(۱)

اس پوری عبارت میں سے اپنی تحریر میں صفحہ: ۲۳ پرصرف اتنا نقل کیا گیا:

''إن الرزق ليس بأجرة لشيء وإنما هو شئ جعله الله له ولكل من قام بشيء من أمور المسلمين ألا ترى أن الفقهاء لهم أخذ الأرزاق''

حالانکہ یہ اختصار اتنا ناقص ہے جس سے پوری عبارت غیر مفہوم ہوکر رہ گئی، اسی طرح علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ تبیین الحقائق میں تحریر فرماتے ہیں:

(۱) احکام القرآن للجصاص: ۲/ ۳۶۳

قَالَ – رَحِمَهُ اللهُ -: (وَرِزْقُ الْقَاضِي) أَيْ حَلَّ رِزْقُ الْقَاضِي مِنْ بَيْتِ الْمَالِ، لِأَنَّ بَيْتَ الْمَالِ أُعِدَّ لِمَصَالِحِ الْمُسْلِمِينَ وَالْقَاضِي مَحْبُوسٌ لِمَصَالِحِهِمْ وَالْحَبْسُ مِنْ أَسْبَابِ النَّفَقَةِ فَكَانَ رِزْقُهُ فِيهِ كَرِزْقِ الْمُقَاتِلَةِ وَالزَّوْجَةِ يُعْطَى مِنْهُ مَا يَكْفِيهِ وَأَهْلَهُ عَلَى هَذَا كَانَتْ الصَّحَابَةُ وَالتَّابِعُونَ "وَبَعَثَ رَسُولُ اللهِ – صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ – عَتَّابَ بْنَ أَسِيدٍ إلَى مَكَّةَ، وَفَرَضَ لَهُ وَبَعَثَ عَلِيًّا، وَمُعَاذًا إلَى الْيَمَنِ، وَفَرَضَ لَهُمَا، وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ وَالْخُلَفَاءُ مِنْ بَعْدِهِ يَأْخُذُونَ كِفَايَتَهُمْ فَكَانَ إجْمَاعًا..... هَذَا إذَا أَعْطَوْهُ مِنْ غَيْرِ شَرْطٍ، وَمُعَاقَدَةٍ كَعَقْدِ الْإِجَارَةِ، وَإِنْ كَانَ بِشَرْطٍ، وَمُعَاقَدَةٍ لَا يَحِلُّ لَهُ أَخْذُهُ، لِأَنَّ الْقَضَاءَ طَاعَةٌ فَلَا يَجُوزُ أَخْذُ الْأَجْرِ عَلَيْهِ كَسَائِرِ الطَّاعَاتِ، وَتَسْمِيَتُهُ رِزْقًا يَدُلُّ عَلَى أَنَّ مَا يَأْخُذُهُ مُقَدَّرٌ بِالْكِفَايَةِ، وَأَنَّهُ لَيْسَ بِأَجْرٍ۔(۱)

اس میں سے بھی رزق واجر میں فرق پر دلالت کرنے والی آخری تین سطریں ذکر نہیں کی گئیں، حالانکہ مسئلہ کی وضاحت کے لیے ان کا ذکر کرنا بہت ضروری تھا۔

نیز ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اما ما یؤخذ من بیت المال فلیس عوضا واجرة بل رزق للاعانة علی الطاعة واخذ الرزق علی العمل لا یخرجه عن کونه قربة ولا یقدح فی الاخلاص لانه لو قدح ما استحقت الغنائم وسلب القاتل (۲)

اسی طرح علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ رزق واجرت میں فرق کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) تبیین الحقائق–کتاب الکراهیة

(۲) الموسوعة الفقهية:۲۲/۲۰۲، عن مطالب اولی النهی

الأموال التي يأخذها القضاة أربعة أقسام رشوة وهدية وأجرة ورزق۔اھ۔(۱)

موفق ابن قدامہ حنبلی رحمۃ اللہ علیہ بھی مغنی کی کتاب الاجارات میں دونوں کے درمیان فرق کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں جس کو شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حاشیہ لامع، باب مایعطي في الرقية علي أحياء العرب بفاتحة الكتاب میں نقل کیا ہے:

فأما الرزق من بيت المال فيجوز على ما تعدى نفعه من هذه الامور لان بيت المال لمصالح المسلمين فاذا كان بذله لمن يتعدى نفعه الى المسلمين محتاجا اليه كان من المصالح و كان للآخذ اخذه لانه من اهله وجرى مجرى الوقف على من يقوم بهذه المصالح بخلاف الاجر۔

درمختار/کتاب القسمۃ میں ہے کہ مال تقسیم کرنے والے کے لیے بھی زیادہ اچھا یہی ہے کہ بیت المال سے اس کے لیے رزق متعین کیا جائے تاکہ وہ بغیر اجرت لیے مال تقسیم کرے لیکن اس کو اجرت پر طے کرنا بھی جائز ہے، کیونکہ مال تقسیم کرنا یہ حقیقۃً قضاء نہیں ہے البتہ قضاء پر اجرت لینا جائز نہیں ان کی عبارت یہ ہے:

وينصب قاسم يرزق من بيت المال ليقسم بلا أخذ أجر منهم وهو احب وان نصب باجر المثل صح لانها ليست بقضاء حقيقة فجاز له أخذ الأجرة عليها وان لم يجز على القضاء۔اھ۔

شیخ الحدیث قدس سرہ نے بھی الابواب والتراجم کے مذکورہ باب میں ان کی یہ عبارت نقل کی ہے۔

---

(۱) جامع الفقه:۷/۱۴۱

صاحب اعلاء السنن نے بھی باب رزق القاضی والعاملین علیہا میں متعدد مواقع میں رزق واجر کے درمیان فرق پر تنبیہ کی ہے،

بلکہ مذکورہ مسئلہ میں تو شافعیہ کا بھی اختلاف نہیں ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں باب رزق الحکام والعاملین علیہا میں مسئلۂ رزق کو بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: ”واتفقوا علی أنه لا یجوز الإستئجار علیه“۔

اور موفق ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ مغنی کی کتاب القضاء میں تحریر فرماتے ہیں:

”والصحیح جواز أخذ الرزق علیه بكل حال لأن ابا بكر رضي الله عنه لما ولي الخلافة فرضوا له الرزق... فاما الإستئجار علیه فلا یجوز قال عمر رضي الله تعالى عنه: لا ینبغي لقاضي المسلمین أن یأخذ علی القضاء أجراً وهذا مذهب الشافعي ولا نعلم فیه خلافا“

شیخ الحدیث حضرت مولانا یونس جونپوری رحمۃ اللہ علیہ درس بخاری میں باب رزق القاضی والعاملین علیہا میں فرماتے ہیں: امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمۃ الباب سے رزق حاکم کا مسئلہ بیان کیا ہے لیکن اچھی طرح سمجھ لو کہ دو چیزیں ہیں ایک رزق الحاکم اور دوسرا استیجار علی الحکومۃ والقضاء۔

حاکم کا رزق یعنی بیت المال سے اس کا کھانا پینا دینا یہ ایک اتفاقی مسئلہ ہے اس میں کسی کا بھی اختلاف نہیں ہے حنفیہ، شافعیہ، حنابلہ سب کا یہی مسلک ہے۔

دوسرا مسئلہ ہے استیجار کا اس میں حنفیہ اور شافعیہ اور حنابلہ متفق ہیں کہ قاضی کو اجرت لینے کی گنجائش نہیں ہے وہ قضاء پر اجرت نہیں لے سکتا، اب جو بخاری نے ”وکان شریح یأخذ علي القضاء أجراً“ نقل کیا ہے اس اجر سے مراد اجرت یعنی استیجار اور معاملہ کر کے اجرت لینا مراد نہیں ہے بلکہ بیت المال سے رزق لینا مراد ہے یعنی اپنے کھانے پینے کی چیزیں لیا کرتے تھے۔(۱)

---

(۱) الفیض الجاری: ۲/ ۱۹۳

❀ اسی طرح امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مذہب دنیا جانتی ہے کہ اجرت علی التعلیم کے عدم جواز کا ہے لیکن کتاب الخراج میں فصل فی ارزاق القضاۃ والعمال'' کی ایک عبارت سے اجرت علی التعلیم کے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ وہاں بھی 'رزق' کا مسئلہ ہے ''اجرت'' کا نہیں۔(۱)

❀ اسی طرح امام ابوبکر جصاص رازی رحمہ اللہ کی احکام القرآن کی درج ذیل عبارت ''إن الرزق لیس بأجرة لشئ وإنما هو شئ جعله الله له ولكل من قام بشئ من أمور المسلمین، الا تری أن الفقهاء لهم أخذ الأرزاق'' سے جواز الاجرۃ علی تعلیم القرآن کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، حالانکہ اس میں وہ خود صراحت کر رہے ہیں کہ رزق جائز ہے ''اجرت'' نہیں، ان کی پوری عبارت اسی عنوان کے تحت ماقبل میں گزر چکی ہے، نیز اس سلسلے میں ان کی احکام القرآن ہی کی صریح عبارات کو نظر انداز کر دیا۔

(۱) سمعون للكذب کی تفسیر کے دوران تحریر فرماتے ہیں:

وفي هذا دليل على أن كل ما كان مفعولاً على وجه الفرض والقُرْبة إلى الله تعالى أنه لا يجوز أخذُ الأجرة عليه كالحجّ وتعليم القرآن والإسلام؛ ولو كان أخذُ الأبدال على هذه الأمور جائزاً لجاز أخذُ الرشا على إمضاء الأحكام، فلما حرم الله أخذ الرشا على الأحكام واتفقت الأمة عليه دلّ ذلك على فساد قول القائلين بجواز أخذ الأبدال على الفروض والقرب۔

(۲) اسی طرح ''إن الذين يكتمون ما أنزل الله من الكتاب ويشترون به ثمنا قليلا'' کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

---

(۱) دیکھیے: مذکورہ تحریر کا صفحہ: ۶ و ۲۱-۲۲

فهي دالة على امتناع جواز اخذ الأجرة عليه اذ غير جائز استحقاق الاجر على ما عليه فعله ... وظاهر ذلك يمنع اخذ الأجر على الإظهار والكتمان جميعا لان قوله تعالى "ويشترون به ثمنا قليلا" مانع اخذ البدل عليه من سائر الوجوه اذ كان الثمن في اللغة هو البدل.... فثبت بذلك بطلان الإجارة على تعليم القران وسائر علوم الدين۔

❁ اسی طرح علامہ عینی کے مسلمانوں کے کسی کام میں مشغول شخص کو بیت المال سے کچھ دیئے جانے کی بات سے بھی اجرت علی التعلیم کے جواز کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ یہاں بھی رزق کا مسئلہ ہے اجرت کا نہیں۔(۱)

اور خود علامہ عینی نے شرح بخاری ہی میں باب ما يعطى في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب میں چار صفحات میں اس مسئلہ پر کتنی مضبوط بحث کی اور امام بخاری کی ایک ایک دلیل کے تفصیلی جوابات دیتے ہوئے کتنی قوت کے ساتھ اجرت علی التعلیم کے عدم جواز کو ثابت کیا ان سب کو نظر انداز کر دیا۔

❁ یہاں تک کہ ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے عامل کی شرح جو خلیفہ سے کر دی اس کو بھی دلائل الجواز علی اجرۃ التعلیم میں شمار کر لیا۔(۲) گویا کہ محرر صاحب کے نزدیک ملا علی قاری بھی مجوزین میں سے ہیں، اور ان کی اس مسئلہ میں درج ذیل صریح عبارات کو نظر انداز کر دیا۔

(۱) شرح نقایہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ويُكْرَهُ للمُؤَذِّنِ أَخذُ الأجرةِ لِمَا رُوِيَ عن عثمان بن أبي العاص قال: "يا رسول الله اجعلني إمامَ قَوْمي، قال: أنت إمامهم واقْتَدِ

---

(۱) دیکھئے مذکورہ تحریر صفحہ:۲۱و۴

(۲) دیکھئے: صفحہ:۶و۲۰

بأضعفهم واتخذ مُؤَذِّناً لا يَأْخُذُ على أذانه أجراً. رواه أبو داود بسند حسن. ولأنّه أجرَةٌ على الطاعةِ وهي غيرُ جائزةٍ، وكذا أَخْذُ الأجرةِ على الحجِّ وتعليمِ القرآنِ والفقهِ، ولكِنَّ المتأخرين جوَّزُوا على التعليمِ والإمامةِ في زماننا لحاجةِ النَّاس وظهورِ التَّوَاني في الأمور الدينية، وعليه الفتوى. والله تعالى أعلم۔(۱)

(۲) نیز ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: لو تزوَّج على تعليم القرآن، يجب مهر المثل، لأنه سمى ما لا يصلح صَداقاً لكونه عبادة، فصار كما لو سَمَّى تعليم الإيمان، أو الصلاة، أو الصوم۔(۲)

(۳) اور شرح مشکوۃ میں بھی حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث قوس کی علامہ طیبی نے جو تاویل کی اس کو رد کرتے ہوئے اس حدیث کو مذہب ابی حنیفہ کی واضح دلیل قرار دیا۔(۳)

❁ بلکہ حد ہی ہوگئی کہ ص:٦ کی آخری سطر میں یہ تحریر کر دیا گیا کہ ''علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے نصب الرایہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل فرمایا ہے کہ آپ دینی تعلیم دینے والوں کے لیے وظیفہ مقرر فرماتے تھے'' گویا کہ علامہ زیلعی نے نصب الرایہ میں اجرت علی التعلیم کے جواز کو ثابت کیا ہے، اس میں اتنا عجیب وغریب ذہول ہے کہ اگر مومن کے ساتھ حسن ظن کا حکم نہ ہوتا تو اس کو تدلیس شدید پر محمول کیا جا سکتا تھا کیوں کہ علامہ زیلعی نے نصب الرایہ میں بہت تفصیل کے ساتھ اجرت علی تعلیم القرآن کے عدم جواز سے متعلق متعدد احادیث وآثار نقل کیے ہیں اور جواز سے

---

(۱) فتح باب العناية بشرح النقاية- كتاب الصلوة- باب الأذان

(۲) فتح باب العناية بشرح النقاية- كتاب النكاح- فصل في المهر وأحكامه

(۳) مرقاة المفاتيح- كتاب البيوع- باب الإجارة

متعلق صرف دو حدیثیں نقل کی ہیں اور ابن الجوزی کے حوالہ سے ان دونوں حدیثوں کے تین جوابات نقل کیے ہیں البتہ مستدلات حنفیہ کے ذیل میں بیہقی کی معرفہ کی کتاب النکاح کے حوالہ سے ایک کلام نقل کیا ہے جو مذکورہ اثر پر ہی مکمل ہو رہا ہے اس کے بعد با قاعدہ زیلعی نے ''انتہی کلامہ'' بھی تحریر کیا ہے تا کہ واضح ہو جائے کہ یہاں تک بیہقی کا کلام تھا یہ پورا کلام نصب الرایہ میں باب الاجارۃ الفاسدہ میں اور بیہقی کی معرفۃ السنن والآثار- کتاب النکاح- باب التزویج علی تعلیم القرآن میں موجود ہے۔

اب اس میں تین باتیں قابل اشکال ہوگئیں:

(۱) سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بیہقی شافعی کی نقل کو زیلعی حنفی کی طرف منسوب کرنا، خاص طور پر اس مسئلہ کی نزاکت کے اعتبار سے آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ یہ ذہول ہے یا تدلیس ہے؟

(۲) زیلعی کے اتنے تفصیلی کلام میں سے صرف ایک سطر جو اپنے مطلب کی تھی اس کو لے لینا اور باقی پورا کلام جو اپنے خلاف تھا اس کو چھوڑ دینا، کیا یہ غیر جانبدار علماء کی شان ہے؟

(۳) اس سے یہ تاثر دینا کہ علامہ زیلعی مجوزین میں سے ہیں اور اس کے معاً بعد علامہ زیلعی کی تبیین الحقائق کے حوالہ سے رزق القاضی کے مسئلہ کو نقل کر کے اس تاثر کو مزید موکد کرنا، کیا یہ علمی دیانت ہے؟(۱)

❁ اسی طرح صفحہ: ۷ پر مذکور ابو عبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الاموال میں مروی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر کہ آپ نے بعض عمال کو لکھا کہ ''تم لوگوں کو قرآن سیکھنے پر وظیفہ دو'' پتہ نہیں اس اثر سے اجرت علی التعلیم کو ثابت کرنا مقصود ہے یا اجرت علی التعلم کو حالانکہ اس سے نہ اجرت علی التعلیم ثابت ہوتی ہے نہ اجرت علی التعلم جیسا کہ پورے اثر کو دیکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہے کیوں کہ اس سے آگے ہے کہ پھر مکتوب الیہ

---

(۱) دیکھئے مذکورہ تحریر صفحہ: ۲۲ و ۶ تا ۷

نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو لکھا تب تو لوگ وظیفہ کے لیے قرآن سیکھیں گے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''اچھا تو پھر مروت اور صحابیت کی بنیاد پر وظیفہ دو'' معلوم ہوا کہ مطلب یہ تھا کہ وظیفہ کی تقسیم میں درجات متعین کرنے میں تعلم قرآن کو بنیاد بناؤ کہ جس نے جتنا زیادہ قرآن پڑھا ہے اس کو اتنا زیادہ وظیفہ دو اس سے تعلیم یا تعلم پر اجرت کو متعین کرنا مقصود نہیں کیوں کہ اس پر تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بہت سخت نکیر فرمائی ہے چنانچہ ابوعبید نے اس کے معاً بعد صحیح سند سے نقل کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ ''جو شخص قرآن پڑھے گا میں اس کو ان لوگوں میں شامل کروں گا جن کو دو ہزار وظیفہ ملتا ہے'' تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''اف اف کیا کتاب اللہ پر دیا جائے گا''۔

اب اس میں پانچ باتیں قابل اشکال ہو گئیں:

(۱) ایک تو یہ کہ آپ نے ابوعبید کے ترجمۃ الباب اور مشمولات باب میں سے ساری چیزیں حذف کر کے صرف اتنا حصہ نقل کیا جس سے یہ تاثر ہو کہ گویا ابوعبید اس باب سے تعلیم و تعلم پر اجرت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ پورا باب دیکھنے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ اس کے مکروہ یا مفضول ہونے کو ثابت کرنا چاہتے ہیں، یہ بات غیر متشدد علماء کی شان کے بالکل مناسب نہیں۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ اثر کا آدھا حصہ جو اپنے دعوے کے موافق محسوس ہوا اس کو لے لینا اور بقیہ آدھے کو جو اپنے خلاف محسوس ہوا اس کو چھوڑ دینا یہ دیانت علمی کے خلاف ہے بلکہ موجودہ صورتحال میں جبکہ اختصار کی وجہ سے معنی پر فرق پڑتا ہو اختصار جائز نہیں جیسا کہ کتب اصول حدیث میں یہ بات مصرح ہے۔

(۳) تیسری بات یہ ہے کہ جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی تجارت کو خلافت میں مخل نہ سمجھنے کی مرجوع عنہ رائے سے شخص مذکور کے استدلال کرنے پر آپ کو اشکال تھا تو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرجوع عنہ قول سے کیسے استدلال کر لیا، حالانکہ صدیق

اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے وقت کا قول وعمل بتا رہا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اپنی پہلی رائے کو قلبی اعتبار سے کلی طور پر ترک نہیں کیا تھا جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رجوع اگلے اثر سے اور موکد ہو جاتا ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ جب آپ نے شخص مذکور پر صحیح، سقیم اور سالم، معلول میں تمیز کی اہلیت نہ ہونے کا الزام لگایا تھا اور اس کے ایک مستدل کے ارسال پر بار بار تنبیہ کی تھی تو آپ کو تو اپنے مستدل میں اس اہلیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا، واضح رہے کہ مذکورہ اثر کے راوی سعد بن ابراہیم کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات سے تقریباً تیس سال بعد ہوئی ہے تو اپنے مستدل کے ارسال پر تنبیہ کیوں نہیں کی گئی۔

(۵) پانچویں بات یہ ہے کہ جب آپ نے شخص مذکور پر درایت اور فہم کی کمی کی وجہ سے سطحی اور غلط اجتہاد کا الزام لگایا تھا تو آپ کو خود تو کم از کم ایسا گہرا اور صحیح اجتہاد کرنا چاہئے تھا جو فہم ودرایت کے کمال پر دلالت کرتا۔

❁ نیز مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے مدینہ منورہ میں گھروں میں جا کر دعوت دینے اور قرآن سکھانے سے مسجد کے بجائے گھروں میں تعلیم کو ثابت کرنا یہ بھی بڑا عجیب وغریب اجتہاد ہے کیونکہ اس وقت تک تو مدینہ منورہ میں کوئی مسجد تعمیر ہی نہیں ہوئی تھی اور اگر آپ کا استنباط اس بات سے ہے کہ التراتیب الاداریۃ میں اس واقعہ کو غلطی سے غزوۂ بدر کے بعد کا قرار دیا گیا ہے تو یہ تو اور زیادہ تعجب کی بات ہے کیوں کہ مجتہد کو اپنے اجتہاد سے پہلے اپنے مستدل کی پوری تحقیق تو کرنی چاہیے تھی اور اس میں تو زیادہ تحقیق کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ اس بات کو تو ہر خاص وعام جانتا ہے اور اس میں تو کوئی اختلاف بھی نہیں ہے، جیسا کہ دو صفحے کے بعد اس کی تفصیل آ رہی ہے۔

❁ اسی طرح علماء کے فروعی فقہی مختلف فیہ مسائل میں براہ راست صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید سے روکنے پر دعوت وتعلیم کے اصول وآداب میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی تقلید کو قیاس کرنا یہ

بھی عجیب وغریب اجتہاد ہے، چلیے نماز کے مسائل کے لیے کتاب الصلاۃ دیکھ لیں گے زکوٰۃ کے مسائل کے لیے کتاب الزکوٰۃ دیکھ لیں گے آپ ہی بتائیے کہ دعوت وتعلیم کے اصول وآداب اس کے طریقے اور نہج کے لیے کونسی کتاب دیکھیں؟ پھر تو مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حیاۃ الصحابہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کو بلا تکلف ذکر کرنا اور اس کے ساتھ ائمہ کے اقوال کو ذکر نہ کرنا یہی غلط ہو گیا، پھر ان کے اس قول کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو حیاۃ الصحابہ کے مقدمہ میں نقل کیا گیا:

”انني قمت بجمع أحوال الصحابة في هذا الكتاب فعلى الأمة الإسلامية أن تقرأ وتستنبط اصول الدعوة منها وتتمسك بهدي النبي صلى الله عليه وسلم في هذه الدعوة“

پھر مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل تحریر کا کیا مطلب ہوگا؟ ”تین قسم کے مسائل ہیں: (۱) نص فہمی کا اختلاف (۲) جہاں روایات میں تعارض ہو اور تطبیق میں اختلاف ہو (۳) استنباطی مسائل جن کے استنباط میں اختلاف ہو جائے تو ان تین قسم کے مسائل میں تقلید کرنی ضروری ہے، ان میں تقلید کے علاوہ کوئی راستہ نہیں، اور یہ مسائل فقہ اسلامی کا بیس فیصد حصہ ہیں، باقی اسّی فیصد مسائل وہ ہیں جو قرآن وحدیث میں صراحۃً آئے ہیں، ان میں کسی امام کی تقلید نہیں، ان میں اللہ ورسول ہی کی تقلید کی جاتی ہے“۔(۱)

نیز یہ بھی بتائیے کہ آپ نے صفحہ: ۲۷ پر ابن الجوزی کے حوالے سے یہ کیوں نقل کیا کہ ”واعظ کو احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حافظ ہونا چاہیے اور تاریخ وسیر کا عالم ہونا چاہیے“ بس اتنا کافی تھا کہ مذاہب ائمہ سے واقف ہونا چاہیے۔

اور آپ ہی بتائیے کہ آپ نے جو مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے خارج مسجد

---

(۱) تحفۃ القاری-۱/۱۰۹

تعلیم کا استنباط کیا وہ کونسے امام سے پوچھ کر کیا ہے؟ اور کونسی زیادتیٔ علم کے ساتھ ہوا ہے، اگر ہم اس بات کو مان بھی لیں کہ شخص مذکور کا استنباط کم علمی کے ساتھ ہوا ہے؟ اور یہ اجتہادات کونسے قریب از کار ہیں اگر شخص مذکور کے اجتہادات دور از کار ہیں؟

(ب) اسی طرح ص: ۱۴ میں حیاۃ الصحابہ میں مذکور روایت پر اکتفا کرنے اور اصل کتاب سے مراجعت نہ کرنے نیز جمیع ما فی الباب روایات کو جمع نہ کرنے کا بھی الزام لگایا۔

❁ اور خود اس سے پہلے ص: ۱۳ میں التراتیب الاداریۃ سے استیعاب اور طبقات بن سعد کے حوالہ سے نقل کیا کہ ''حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے مختصر عرصہ کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مدینہ طیبہ تشریف لائے''۔

حالانکہ اسلامی تاریخ سے ادنی واقفیت رکھنے والا بھی یہ بات جانتا ہے کہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت سے کافی پہلے مدینہ طیبہ تشریف لا چکے تھے، اور ان کے واقعات اس سلسلہ میں بہت مشہور ہیں۔

اگر استیعاب اور طبقات ابن سعد کی مراجعت کر لی ہوتی تو اتنی بڑی غلطی نہ ہوتی، اصل میں التراتیب الاداریۃ میں نقل میں دو قولوں کے درمیان خلط ہو گیا ہے، استیعاب کی عبارت ابن ام مکتوم کے ترجمہ میں اس طرح ہے: ''**واختلف في وقت هجرته فقيل كان ممن قدم المدينة مع مصعب بن عمير قبل رسول الله صلى الله عليه وسلم. وقال الواقدي قدمها بعد بدر بيسير فنزل دار القراء**'' اور طبقات ابن سعد میں ابن ام مکتوم کے ترجمہ میں ہے ''**وقدم مهاجرا بعد بدر بيسير فنزل دار القراء وهي دار مخرمة بن نوفل**'' اور اس سے تھوڑا آگے چل کر ابن سعد لکھتے ہیں: ''**وقد روى لنا ان ابن أم مكتوم هاجر إلى المدينة قبل ان يقدم رسول الله صلى الله عليه وسلم المدينة وقبل بدر**'' پھر ایک تو وہیں پر اور دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صدیق اکبر کی ہجرت کے بیان میں صحیح سندوں سے

حضرت براء بن عازب کی یہ حدیث نقل کی:

"أول من قدم علینا من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصعب بن عمیر و ابن أم مکتوم فجعل یقرئان الناس القرآن ثم جاء عمار و بلال و سعد ثم جاء عمر بن الخطاب في عشرین ثم جاء رسول اللہ علیہ وسلم - وفی روایة - کان اول من قدم علینا من المهاجرین مصعب بن عمیر ..... ثم اتانا بعدہ عمرو بن ام مکتوم الأعمی"

ان سب کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ سب سے پہلے مدینہ طیبہ ہجرت کرنے والے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ہیں البتہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے سلسلے میں اختلاف ہے، صحیح سندوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اور ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی یا سب سے پہلے مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اکیلے ہجرت کی اور پھر ان کے کچھ دنوں کے بعد دوسرے نمبر پر ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے ہجرت کی اور یہ دونوں مدینہ والوں کو قرآن سکھاتے تھے، البتہ واقدی کا قول یہ ہے کہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے کچھ دن کے بعد ہجرت کی اور مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کے گھر میں جس کو دار القراء کہا جاتا تھا قیام کیا۔

لیکن اس قول پر صحیح حدیث کے مخالف ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی اشکال ہے کہ مخرمہ بن نوفل تو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہونے والوں میں سے ہیں تو غزوۂ بدر کے زمانہ میں ان کا گھر اس معنی کے اعتبار سے دار القراء کیسے ہوسکتا ہے جو یہاں مراد لینے کی کوشش کی جارہی ہے، بہرحال ان سب چیزوں کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شخص مذکور کو جو اصل کتاب سے مراجعت کرنے کی اور جمیع مافی الباب روایات کو جمع کرنے کی نصیحت کی تھی اگر خود بھی اس پر عمل کرلیا ہوتا تو اتنی بڑی غلطی نہ ہوتی، بلکہ صفحہ: ۱۳۰ میں علامہ کتانی رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارت ابن قدامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الاستبصار" کے حوالے سے نقل کی ہے کہ "حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کے گھر قیام فرمایا پھر

یہ دونوں حضرات انصار کے مختلف گھروں میں جاتے اور قرآن کریم پڑھاتے اور ان کو اللہ کی طرف بلاتے تھے" صرف اس سے اگلی اور پچھلی عبارت ہی میں غور فرما لیتے تو اتنی بڑی چوک نہ ہوتی، ہم التراتیب الاداریۃ سے علامہ کتانی کی پوری عبارت پیش کرتے ہیں: **فصل ذکر من بعثه النبي صلى الله عليه وسلم الى الجهات يعلم الناس القران ويفقههم في الدين** میں تحریر فرماتے ہیں:

> **في سيرة ابن اسحاق لما انصرف النبي صلى الله عليه وسلم من القوم الذين بايعوه في العقبة الأولى قال وهم اثناعشر بعث معهم مصعبا وأمره أن يقرئهم القرآن ويعلمهم الإسلام ويفقههم في الدين وكان يسمى المقرئ بالمدينة، قلت: في الإستبصار لابن قدامة المقدسي "لما قدم مصعب بن عمير رضي الله تعالى عنه المدينة نزل على اسعد بن زرارة فكان يطوف به على دور الأنصار يقرئهم القرآن ويدعوهم الى الله عز وجل فاسلم على يديهما جماعة منهم سعد بن معاذ وأسيد بن حضير رضي الله تعالى عنهما وغيرهما" وفي التهذيب للنووي لدي ترجمة مصعب هذا: هاجر الى المدينة بعد العقبة الأولى يعلم الناس القرآن ويصلي بهم، بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم مع الاثني عشر اهل العقبة الثانية ليفقه اهل المدينة ويقرئهم القرآن فنزل على اسعد بن زرارة۔اھ۔**

ان سب عبارات سے واضح ہے کہ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر کے بعد نہیں بلکہ سب سے پہلے ہجرت کرنے والے ہیں۔

❁ اسی طرح سے گزشتہ عنوان کے تحت جو علامہ زیلعی سے نقل کا مسئلہ تھا اس میں اگر نصب الرایہ سے نقل کرنے پر اکتفاء نہ کیا جاتا بلکہ معرفۃ السنن سے مراجعت کر لی

جاتی اور جمیع مافی الباب نہیں تو کم از کم جمیع مافی نصب الرایہ کو جمع کر لیا جاتا تو اتنا بڑا ایہام سامنے نہ آتا جس کی تفصیل پچھلے عنوان کے تحت چند صفحات پہلے گزری ہے۔

❁ اسی طرح شخص مذکور کو احاطۂ جمیع مافی الباب کی نصیحت کے باوجود ایک طرف صفحہ: ۱۸ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا "**ویح عمر إني أخاف أن لا یسعني أن آکل من ھذا المال شیئا.... فلما حضره الموت قال قد کنت قلت لعمر إني أخاف أن لا یسعني أن آکل من ھذا المال شیئا فغلبني فاذا أنا مت فخذوا من مالي ثمانیة آلاف درھم وردوھا في بیت المال**" اور دوسری طرف صفحہ: ٦ میں علامہ برکوی سے نقل کر دیا کہ "انہوں نے بیت المال کے وظیفے سے شبہ کی بنیاد پر بچنے کو جہالت قرار دیا"۔

کسی دعوے کو ثابت کرنے میں اتنا غلو علماء کی شان کے مناسب نہیں کہ حمایت میں برکوی کا قول بھی مل جائے تو قابل احتجاج ہو جائے اور مخالفت میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قول بھی نظر انداز کر دیا جائے۔

بلکہ بات یہاں تک پہنچ گئی کہ برکوی کے قول کے مقابلہ میں احادیث صحیحہ تک کو نظر انداز کر دیا گیا جو کہ احاطۂ جمیع مافی الباب کی نصیحت کے صریح خلاف ہے چنانچہ مذکورہ بالا قول کے معًا بعد فی زماننا کی قید کو ترجمے میں حذف کر کے برکوی سے یہ نقل کر دیا گیا کہ "بیت المال اور اوقاف کی آمدنی اور دوسرے ذریعۂ معاش میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ بیت المال وغیرہ کی آمدنی زیادہ پاکیزہ ہے" اور بخاری کی حدیث مرفوع: "**ما أکل أحد طعاما قط خیرا من أن یأکل من عمل یده وأن نبي الله داؤد علیه السلام کان یأکل من عمل یده**" کو نظر انداز کر دیا حالانکہ اگر برکوی کے قول کی کوئی تأویل نہ کی گئی تو وہ اس حدیث کے صریح خلاف ہے، نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس نکیر کو بھی نظر انداز کر دیا جو انہوں نے اس وقت کی تھی جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے مال کی فراوانی اور بیت المال سے وظیفہ ملنے کی وجہ سے خود تجارت کرنی چھوڑ دی تھی، التراتیب الاداریۃ میں باقاعدہ باب منعقد کیا گیا: "**باب**

تشدید عمر علي الصحابة في ترکهم الإتجار لغیرهم من العامة و الاخلاط"
اور اس مسئلہ میں تو اور بھی احادیث و آثار موجود ہیں۔

(ج) اسی طرح صحیح وسقیم اور سالم اور معلول کی تمیز کی اہلیت نہ ہونے اور روایات کی تحقیق کے عمل سے قاصر ہونے نیز منکر اور معلول روایات کو صحیح سمجھ لینے کا بھی الزام لگایا گیا اور بظاہر اسی الزام کو ثابت کرنے کے لیے حیاۃ الصحابہ کی ایک روایت جو بیہقی کے حوالہ سے تھی اس کے مرسل ہونے اور اس میں غیر معروف راویوں کے ہونے پر ص:۱۹ میں ایک نہیں دو مرتبہ تنبیہ کی حالاں کہ اس روایت کے متابعات وشواہد کثیرہ کے ہوتے ہوے اس کلام کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے جیسا کہ پورے کلام سے ظاہر ہے، نیز غیر معروف راویوں کے ہونے کی بات بظاہر اس بنیاد پر کی گئی کہ اس کے دو راویوں کے بارے میں جرح وتعدیل کی صراحت نہیں ملی لیکن واضح رہے کہ اتنی بات سے راویوں کو غیر معروف یا مجہول نہیں کہا جاتا ایسے راوی تو صحیحین میں بھی سینکڑوں ہیں مزید برآں یہ کہ ان دو میں سے ایک راوی حاکم کے استاد ہیں اور حاکم نے ان کی روایت کی تصحیح کی ہے اور رہی مرسل ہونے کی بات تو یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مراسیل کی اکثر ائمہ نے تعریف کی ہے، یہ ساری گفتگو ہم نے محدثین کے مذہب کے اعتبار سے کی ہے ورنہ حنفیہ کے نزدیک قرون ثلاثہ کی مرسل بھی مقبول ہے اور قرون ثلاثہ کے مسلمانوں میں عدالت اصل ہے جب تک اس کے خلاف ثابت نہ ہو جائے، تو سامنے والے کی روایت کی تحقیق میں تو اتنا زور لگایا گیا، اور اس کے برعکس اپنے مستدلات کے پیش کرنے میں متعدد مواقع میں صرف اتنا کہنے پر اکتفاء کیا گیا کہ فلاں مصنف نے اس کو بسند بیان کیا ہے حالاں کہ یہ بات مقام احتجاج میں خاص طور پر جبکہ سامنے والے سے صحیح اور معلول میں تمیز کا مطالبہ کیا جارہا ہو قطعاً کافی نہیں کیوں کہ صحیح، حسن، ضعیف، موضوع، منکر، معلل سب روایتیں سند ہی سے مروی ہوتی ہیں۔

❁ اور ایک جگہ تو حد ہی ہوگئی ص: ۷ میں تحریر ہے ''ابن عساکر (م ۵۷۱ھ) نے تاریخ دمشق میں بسند بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ میں تین معلم بچوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان میں سے ہر ایک کو ماہوار پندرہ درہم برائے خورد و نوش دیتے تھے''۔

اول تو اس میں یہ بات ہے کہ یہ حدیث سنن بیہقی (۶ / ۱۲۴) اور مصنف ابن ابی شیبہ (۲۱۲۲۸) میں موجود ہے جو کہ زمانہ کے اعتبار سے ابن عساکر سے بہت مقدم اور قوت و صحت کے اعتبار سے تاریخ ابن عساکر سے بہت بلند مانی جاتی ہیں تو ان دونوں کو چھوڑ کر ابن عساکر سے نقل کرنا باب تحقیق میں کتنی کمزور بات ہے جبکہ ابن عساکر نے بیہقی ہی کی سند سے نقل کیا اور بیہقی نے ابن ابی شیبہ کی سند کا حوالہ دیا ہے۔

دوسری اس سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ اثر وضین ابن عطاء سے منقول ہے جن کی پیدائش حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات کے (۶۲) سال کے بعد ہوئی ہے تو دوسرے کے مستدل کے ارسال کا بار بار تذکرہ کرنا اور اپنے مستدل کے اعضال کا بھی کوئی تذکرہ نہ کرنا یہ انتہائی قابل تعجب ہے، جبکہ حسن بصری اور وضین ابن عطاء کے درمیان علم و مرتبہ کے اعتبار سے فرق بھی کسی پر مخفی نہیں۔

❁ اس سے بھی زیادہ قابل تعجب یہ ہے کہ ص: ۶ میں تحریر ہے ''حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شام کی ولایت پر سالانہ دس ہزار دینار دیا کرتے تھے''۔

یہ بات ایسی ہے کہ اس پر جتنا تعجب کیا جائے کم ہے کیونکہ اول تو اس میں یہ بات ہے کہ اس طرح کا جملہ ایسے موقع پر کہا جاتا ہے جبکہ مصنف نے وہ حدیث اپنی سند سے نقل کی ہو اور یہاں حافظ ابن عبدالبر (متوفی: ۴۶۳ھ) نے مذکورہ اثر کو اسد بن موسیٰ (متوفی: ۲۱۲ھ) کی سند سے نقل کیا ہے اپنی سند سے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ اسد بن موسیٰ کی جو سند نقل کی ہے اس کا حال بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کیونکہ اس کے رواۃ کی تعیین ہی آسان نہیں بظاہر اسی وجہ سے امام نسائی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے

بارے میں فرمایا ہے: "لو لم یصنف کان خیرا له" تیسری بات یہ ہے کہ اس کے متن میں بھی نکارت محسوس ہوتی ہے کیونکہ جس عمر رضی اللہ عنہ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے ڈھائی سال میں صرف چھ ہزار، وہ بھی درہم طے کیے ہوں اسی عمر رضی اللہ عنہ کا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے صرف ایک سال میں دس ہزار وہ بھی دینار طے کرنا بعید معلوم ہوتا ہے جبکہ ابن سعد، ابن عساکر، ذہبی، ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم جیسے محققین نے صرف ماہانہ اسّی دینار کا قول ہی نقل کیا ہے(۱) معلوم ہوا کہ اس روایت کے نقل کرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ صحیح، سقیم اور سالم، معلول میں تمیز کی اہلیت کا بالکل استعمال نہیں کیا گیا اور نہ جمیع ما فی الباب کو جمع کرنے کی طرف مطلق توجہ کی گئی۔

- حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تیسرا اثر جو سعد بن ابراہیم کی سند سے نقل کیا گیا اس کے انقطاع کا بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا۔

(د) نیز موصوف کے اوپر غلط نسبت کا ارتکاب کرتے رہنے کا الزام لگایا

اور خود امام ابو یوسف، امام جصاص، علامہ زیلعی، علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ ائمہ اور علماء کی عبارتیں اس انداز سے پیش کیں جس سے ان کی طرف جواز الاجرۃ علی التعلیم کے قول کی نسبت ہو گئی حالانکہ اس کے خلاف ان کی صریح عبارات موجود ہیں جیسا کہ سابق میں ہم اس کا تفصیل سے ذکر کر چکے ہیں۔

(ہ) اسی طرح موصوف پر اپنی طرف سے تصرف و اضافہ کرتے رہنے کا الزام لگایا

اور خود ابن بطال کی شرح بخاری سے جو عبارت نقل کی ص: ۲۰ پر اس میں سے "**وفساد قول من حرم اخذ الأجور علی أعمالهم**" کو حذف کر دیا تا کہ لوگوں کو نہ پتہ چلے کہ ابن بطال کا یہ کلام ائمۂ احناف کے رد میں ہے، حالانکہ اس جملے کے حذف کی وجہ سے عبارت میں بھی خلل واقع ہو گیا۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: متمۃ طبقات ابن سعد، تاریخ دمشق، تاریخ اسلام، سیر اعلام النبلاء، البدایۃ والنہایۃ میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ترجمہ

یہ غلو مذموم کے قبیل کی چیز ہے کہ ترجمان مذہب احناف ہونے کے باوجود ایسے کلام سے بھی استدلال کرلیا جائے جو احناف کے رد میں نقل کیا گیا اور خود تو کیا صراحت کرتے کہ یہ کلام ائمۂ احناف کے رد میں ہے بلکہ اس کلام کی نقل میں ایسا تصرف کیا گیا کہ کسی کو اس بات کا پتہ بھی نہ چلے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کسی موقع پر پڑھی ہوئی بات کو کسی دوسرے موقع پر بیان میں حفظ نقل کر رہا ہے تو اس کا تصرف (**علی سبیل الفرض والتسلیم**) زیادہ قابل مواخذہ ہے یا اس شخص کا تصرف جو کتاب کھول کر ایک عبارت نقل کر رہا ہے اور اس پر یہ حوالہ دے رہا ہے، (**شرح صحیح البخاری لابن بطال: ۵/۲۵۹، مکتبۃ الرشد ریاض**) پھر اسی مکتبہ کے اسی جلد کے اسی صفحے پر جب مراجعت کی جارہی ہے تو یہ تصرف سامنے آرہا ہے۔

اگر ابن بطال ہی کے کلام سے استدلال کرنا تھا تو کتاب الاجارات میں **باب مایعطی فی الرقیۃ بفاتحۃ الکتاب** جو کہ اصل اس مسئلہ کا ماخذ ہے اس میں ان کی درج ذیل عبارت سے استدلال کرلیا ہوتا جس کو انہوں نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر نقد کرتے ہوئے ابن المنذر کے حوالے سے نقل کیا ہے: "**وابو حنیفۃ یکرہ تعلیم القرآن بالاجر ویجوز ان یستأجر الرجل ان یکتب لہ نوحا او شعرا او غناء معلوما بأجر معلوم فیجیز الإجارۃ فیما ھو معصیۃ ویبطلھا فیما ھو طاعۃ للہ تعالی**" کہ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھو کہ وہ معصیت میں تو اجارہ کو جائز قرار دیتے ہیں اور اطاعت میں اجارہ کو باطل قرار دیتے ہیں۔(۱)

اگر آپ کو اپنے مدعیٰ کو ثابت کرنے کے لیے علماء کی ان عبارات سے بھی استدلال کرنا تھا جن میں ائمۂ احناف پر رد کیا گیا ہے تو مذکورہ بالا عبارت اس مسئلہ میں زیادہ واضح ہے۔

❁ نیز اس تحریر میں بعض مواقع میں اپنی طرف سے لفظ "دینی" کا اضافہ کر دیا گیا جیسے: ص: ۲۳ میں تاریخ دمشق کے حوالہ سے نقل کیا گیا: "**قال ثلاثۃ معلمین**

(۱) نیز دیکھیے: الأشراف لابن المنذر، کتاب الإجارات، باب أجور المعلمین

کانوا بالمدینة یعلمون الصبیان و کان عمر بن الخطاب یرزق کل واحد منھم خمسة عشر درھما کل شھر"اورص:۷ پراس کا ترجمہ کیا گیا کہ"مدینہ منورہ میں تین معلم بچوں کو دینی تعلیم دیا کرتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان میں سے ہر ایک کو ماہوار پندرہ درہم برائے خورد و نوش دیتے تھے' حالانکہ اس میں ایک اور احتمال بھی ہے کہ دینی تعلیم مراد نہ ہو بلکہ لکھنا پڑھنا سکھانا مراد ہو جس کو ہم ان شاءاللہ آئندہ بیان کریں گے۔

(و) **اسی طرح صفحہ: ۱۳ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی سیرت کے کسی جزوی واقعے کو امت کے سامنے اسوہ بنا کر پیش کرنے پر اعتراض کیا گیا۔**

اور خود صحابہ کی مسجد میں تعلیم دین کے عمومی طریقے کو چھوڑ کر مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ایک جزوی واقعے سے معلوم نہیں کس اصول کے تحت استدلال کیا گیا جبکہ اس وقت تک کسی مسجد کی تعمیر بھی نہیں ہوئی تھی۔

اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ امر مذکور پر صرف لفظ"دارالقراء"ہی سے استدلال کر لیا گیا اور اس کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ یہ تحقیق کی جاتی کہ اس کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ یہ درسگاہ تھی یا دارالاقامہ تھا؟ سیرت میں کوئی واقعہ ملتا ہے جس سے اس میں دینی تعلیم کا ثبوت ہوتا ہو؟ پھر یہ کہ جب مخرمہ بن نوفل رضی اللہ عنہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوے تو غزوۂ بدر کے وقت ان کا گھر مدرسہ کیسے بن گیا وغیرہ جبکہ قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ خیر القرون کی درسگاہیں اور ان کا نظام تعلیم و تربیت (۱) میں فرماتے ہیں: علماء اسلام نے مسجدوں کو تعلیم و تعلم کا مرکز بنایا اور دو تین صدیوں تک یہ سلسلہ جاری رہا، اس درمیان میں تعلیم کے لیے یا طلبہ کے لیے کسی مستقل عمارت کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

ایک طرف علامہ کتانی رحمۃ اللہ علیہ کے استدلال کو قبول کرنے میں اتنا تسرع، دوسری طرف شخص مذکور سے اتنا زیادہ تحقیق کا مطالبہ! یہ شان انصاف کے خلاف ہے۔

---

(۱) ص:۱۵-۱۶

(ز) اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صفحہ: ۱۴ میں موصوف پر درایت اور فہم کی کمی کی وجہ سے سطحی اور غلط اجتہاد کی بنا پر متقدمین ومتاخرین سارے فقہاء کے خلاف نتیجے پر پہنچنے کا الزام لگایا گیا۔

اور خود اس نتیجے پر پہنچے جو کہ اس پوری تحریر کا اصل لب لباب اور خلاصہ ہے کہ دینی تعلیم پر ذہنی یکسوئی اور جمعیت قلب کے لیے دنیوی اسباب معاش کو چھوڑ کر تنخواہ اور وظیفہ قبول کرنا رخصت ہی نہیں بلکہ عزیمت ہے جائز ہی نہیں بلکہ افضل ہے، بلکہ عین منشا شریعت کے مطابق ہے، متاخرین ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کا اتباع ہے، بضرورت ہی نہیں بلکہ بلاضرورت بھی مستحسن ہے۔

چنانچہ صفحہ: ۸ کی آخری سطر میں تحریر ہے ''کفالت قبول کرنا نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ عین منشا شریعت کے مطابق اور موجودہ زمانے میں مستحسن ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کی سیرت سے ثابت ہے''۔

صفحہ: ۹ سطر ۵-۷ میں تحریر ہے ''لہٰذا مقرر صاحب کا دینی خدمات میں مشغول افراد کو تجارت کی دعوت اس بنیاد پر دینا کہ وہ اپنی کفالت خود کر کے مخلوق سے استغنائیت حاصل کریں اور ان کا مجاہدہ کامل ہو بجائے خود سیرت سے ناواقفیت پر مبنی ہے، دینی خدمت اختیار کرتے ہوئے ذہنی یکسوئی اور جمعیت قلب کے لیے تنخواہ اور وظیفے کو قبول کرنا تجارت سے بھی افضل ہے''۔

صفحہ: ۹ سطر: ۹-۱۰ میں تحریر ہے ''بلکہ بعض مصالح کے سبب بلاضرورت بھی تنخواہ قبول کر لینا مستحسن قرار دیا گیا ہے''۔

صفحہ: ۱۱ سطر: ۱۱-۱۳ میں تحریر ہے آج بھی ''جو طالبان علوم نبوت، علمائے کرام، محدثین اور دینی خدام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے دنیاوی اسباب معاش کو چھوڑ کر معمولی وظیفے پر علم دین کے تحفظ اور اشاعت میں زندگیاں کھپا رہے ہیں یہ بلاشبہ ان کی عزیمت کی بات ہے''۔

حالانکہ یہ نتیجہ جو اخذ کیا گیا یہ اتنا ہی نہیں کہ فقہاء متقدمین ومتأخرین کے خلاف ہے بلکہ متقدمین ومتأخرین محدثین واہل تاریخ وسیر کے بھی خلاف ہے۔ بلکہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے بقول تو خواص وعلماء ہی نہیں بلکہ یہ بات دین اسلام کی اتنی مشہور اور متواتر اور اتنی بدیہی ہے کہ مسلمانوں کے عوام میں سے بھی کسی پر مخفی نہیں کہ بغیر اجرت کے تعلیم قران وعلم تمام اعمال میں سب سے افضل اور تمام اعمال میں اللہ کو سب سے زیادہ محبوب ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وتابعین واتباع تابعین اور مشاہیر علماء مفسرین ومحدثین وفقہاء رحمۃ اللہ علیہم بغیر اجرت ہی کے تعلیم دیتے تھے۔

مجموع الفتاوىٰ میں ان کی عبارت اس طرح ہے:

”اما تعليم القرآن والعلم بغير اجرة فهو افضل الاعمال واحبها الى الله وهذا مما يعلم بالاضطرار من دين الاسلام ليس هذا مما يخفى على احد ممن نشأ بديار الاسلام والصحابة والتابعون وتابعوا التابعين وغيرهم من العلماء المشهورين عند الأمة بالقرآن والحديث والفقه انما كانوا يعلمون بغير أجرة فلم يكن فيهم من يعلم بأجرة اصلا“(۱)

دیوبند سے آنے والی طلبہ کی ایک جماعت سے حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جتنی ضرورت اس کی ہے کہ اللہ ہی سے امیدیں رکھی جائیں اتنی ہی ضرورت اس کوشش کی ہے کہ غیر اللہ سے امیدیں نہ رکھی جائیں بلکہ ماسوی اللہ سے بالکل صرف نظر کر کے کام کرنے کی مشق کی جائے، **"إن أجري إلا على الله"**۔(۲)

ان طلبہ ہی سے فرمایا: تم انبیاء علیہم السلام کے نائبین ہو جو ساری دنیا سے کہہ دیتے ہیں **”إن أجري إلا على الله“** تمہارا کام یہ ہے کہ سب سے امیدوں کو منقطع

---

(۱) مجموع الفتاوى:۳۰/۲۰۴

(۲) ملفوظات-۱۵۲

کرتے ہوئے اور صرف اللہ کے اجر پر یقین واعتماد رکھتے ہوئے تواضع اور تذلل سے مومنین کی خدمت کرو اسی سے عبدیت کی تکمیل وتزیین ہوگی۔(۱)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک بیان میں فرمایا: آج جو تعلیم کی جگہوں پر تنخواہ کی اجازت دی جاتی ہے وہ اس لیے کہ یہ علم اور دین کا کام ختم نہ ہو جائے اور علم حاصل کرنے والے کوئی باقی نہ رہیں، تو یہ جو اجرت کی اجازت ہے وہ اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ کرنے کے اعتبار سے طے کیا ہے اور یہ طے کرنا بھی عارض کی وجہ سے ہے اور یہ حسن لغیرہ ہے تو حسن لغیرہ کی وجہ سے بدرجۂ مجبوری تنخواہ لینا جائز ہوا لیکن حسن لذاتہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ کا کام لوجہ اللہ کیا جائے کسی مخلوق سے مطالبہ نہ کیا جائے تعلیم بھی اللہ کے لیے دی جائے اور اس سے کچھ مانگا نہ جائے نہ اپنے شاگرد سے کچھ مانگے اور نہ کسی سے، ”إن أجری إلا علی اللہ“۔(۲)

نیز اسی بیان میں فرمایا: آج کل جو تنخواہ لی جاتی ہے یہ اس کام کا بدل نہیں ہے بلکہ ان تمام شعبوں کو باقی رکھنے کے لیے فقہاء کرام نے اس کو جائز قرار دیا ہے کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو پھر یہ دین کے شعبے کیسے باقی رہیں گے؟ اس لیے جب فقہاء کرام نے اسے جائز قرار دیا ہے تو اسے ناجائز کون کہہ سکتا ہے، یہ جائز ہے حسن لغیرہ کی صورت میں، حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ فقہاء نے اجازت دی ہے اس لیے چلو اس کو باقی رکھو لیکن اس کے ساتھ حسن لذاتہ کو بھی زندہ کرو۔(۳)

نیز ایک بیان میں فرمایا: بہر حال اپنا خرچ لیکر چلیں اور اس کام کو اور خرچ کو حسن لذاتہ بنائیں نہ کہ حسن لغیرہ، اگر کوئی مدرسہ سے تنخواہ لیتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی عارض کی

---

(۱) ملفوظات-۱۵۷

(۲) مواعظ عبیدیہ: ۲/ ۲۰۹-۲۱۰

(۳) مواعظ عبیدیہ: ۲/ ۲۱۰-۲۱۱

وجہ سے لے رہا ہوتو اسے منع نہ کریں، لیکن حسن لذاتہ کو بھی زندہ کرنا ہے۔(۱)

حضرت محی السنہ شاہ ابرار الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلام میں تحریر ہے: دین کی محنت اور خدمت کا اصل طریقہ نبوت کا بدون اجرت کرنا تھا۔۔۔۔اور ہدایت یافتہ ہونا۔۔۔۔اور حق تعالی شانہ سے اجر کا امیدوار ہونا یہ تین باتیں دعوت اور خدمت دین کا علی منہاج النبوۃ طرز ہے، لہذا نائبین انبیاء علیہم السلام کو نیابۃً اسی طرز کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کرنا چاہیے یعنی قلب میں یہی جذبہ اور نیت کارفرما ہو کہ یا اللہ! یہ تنخواہ اپنی مجبوری سے لے رہا ہوں ورنہ متبادل آمدنی کے لیے کوئی جائیداد وغیرہ ہوتی تو اے اللہ! آپ کے دین پاک کی خدمت بدون کسی معاوضہ اور وظیفہ کے کرتا۔(۲)

قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے مکاتب (کتاتیب) کا انتظام کیا، اور ان کے معلمین کے لیے مشاہرہ اور تنخواہ جاری کی، مگر فقہاء صحابہ کے تعلیمی حلقے اور مجلسیں بالکل حسبۃً للہ تبلیغ دین اور ان اجری الا علی اللہ کے اصول پر منعقد ہوتی تھیں، اور اس کے لیے مشاہرہ اور وظیفہ مقرر نہیں تھا، ۲۰ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیت المال سے وظیفہ کا انتظام کیا اور حسب حیثیت لوگوں کے جو وظیفے مقرر کئے گئے وہی ان کے لیے کافی تھے، دینی علوم کی تعلیم شہروں کی امارت، جہاد کی امارت، قضاء اور اسی قسم کے منصب کے لیے علیحدہ رقم اور وظیفہ کا انتظام نہیں تھا، حضرات صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو اپنا وظیفہ لینا پسند نہیں کرتے تھے اور بعض اپنے مقررہ وظیفہ سے کم لیتے تھے، وہ کار نبوت پر اجرت تو کیا لیتے خود طالب علموں کو اپنے مال سے حصہ دینے پر آمادہ تھے۔۔۔۔۔ یہ تعاون حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی صوابدید اور مصلحت کے تحت کیا

---

(۱) مواعظ عبیدیہ: ۲/ ۲۲۳

(۲) مجالس الابرار: ۱۹۵، تعلیم و تعلم: ص: ۱۵

تھا اس میں ان حضرات کی طلب و خواہش کو دخل نہیں تھا..... جن حضرات کے استغناء کا یہ حال تھا کہ ان کے وظیفے کی رقم بیت المال میں پڑی رہتی تھی وہ دینی خدمت پر اجرت کیا لیتے۔(۱)

ابو عبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الاموال میں باب الفرض علی تعلیم القران میں ابو غیلان سے نقل کیا ہے: **بعث عمر بن عبد العزیز یزید ابن ابی مالك الدمشقي و الحارث بن یمجد الاشعري یفقهان الناس في البدو و أجری علیهما رزقا، فاما یزید فقبل و اما الحارث فأبی ان یقبل فکتب الی عمر بن عبد العزیز بذلك، فکتب عمر انا لا نعلم بما صنع یزید باسا و اکثر الله فینا مثل الحارث بن یمجد۔** حضرت عمر ابن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھی اس صورت میں ہے جبکہ پہلے سے طے نہیں تھا۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: اس زمانہ تک تعلیم کا سلسلہ معاوضہ کی بنیاد پر نہیں قائم ہوا تھا، علماء بطور خود اپنے گھروں پر یا مسجدوں میں لوگوں کو مفت تعلیم دیتے تھے اور یہ سلسلہ اس قدر وسیع اور مفید تھا کہ آج تک اس سے بڑھ کر نہ ہو سکا۔(۲)

حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فضائل تجارت میں تعلیم دین پر اجرت لینی چاہئے یا نہیں لینی چاہئے اس پر محققانہ تفصیلی کلام سے فارغ ہو کر آخر میں یہی خلاصہ کیا ہے کہ اصل عزیمت کی بات تو یہی ہے کہ بغیر تنخواہ اور وظیفے کے تعلیم دی جائے، لیکن اس کے لیے توکل شرط ہے، تحریر فرماتے ہیں: جب تک آدمی ان حضرات کے برابر زہد و توکل حاصل نہ کرلے محض اوپر سے دیکھ کر ان کے کاموں کو نہ اختیار کرے ہاں جب اس مرتبہ تک پہنچ جائے اور اپنے اوپر اتنا اعتماد

(۱) خیر القرون کی درسگاہیں: ۱۱۳-۱۱۴

(۲) سیرت النعمان صفحہ: ۲۷

ہو جائے کہ دونوں کاموں کو نبھا سکے تو یہ یقیناً بہتر ہے، اسی واسطے ہمارے اکابر کا یہی دستور رہا ہے چنانچہ حضرت گنگوئی رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں سہارنپور میں دس روپے تنخواہ پر بچوں کو پڑھانے کے لیے ملازمت کی اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بھی گزر چکا کہ کچھ دنوں حدیث پڑھانے پر تصحیح کتب پر تنخواہ لی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے ابتداء میں کانپور میں ملازمت کی اور بعد میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے خط وکتابت سے مشورہ کیا کہ ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تین مرتبہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو خطوط لکھے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے تینوں دفعہ ملازمت چھوڑنے کی ممانعت فرمادی اور چوتھی دفعہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ملازمت چھوڑ کر تھانہ بھون آ کر خط لکھا کہ حضرت میں ملازمت چھوڑ کر آ گیا تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت اظہار مسرت کیا اور بہت دعائیں دیں اور یہ تحریر فرمایا کہ انشاءاللہ تعالیٰ روزی سے پریشان نہیں ہوگے میرے والد صاحب چونکہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خطوط لکھا کرتے تھے حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ تین دفعہ انہوں نے اجازت مانگی اور اپ نے منع کر دیا اور اب ملازمت چھوڑنے پر دعائیں دیں تو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مشورہ وہ کیا کرتا ہے جس کے دل میں ڈگڈگا ہو اور جب پختہ ہو جائے تو مشورہ نہیں کرتا.....

مجالس حکیم الامت صفحہ: ۳۵ پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت ممدوح کے علمی اور عملی کمالات سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو ان کی بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ معاشی ضرورت کا احساس ہوا تو مطبع مجتبائی دہلی میں کتابوں کی تصحیح کے لیے ملازمت اختیار کر لی کل دس روپے ماہوار تنخواہ طے تھی ایک مرتبہ اس سے بھی جی گھبرایا تو اپنے شیخ حضرت حاجی امداداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کیا کہ یہ تنخواہ لینا بھی چھوڑ دیں اور جو کام بھی کریں لوجہ اللہ تعالیٰ بے تنخواہ کریں، حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امام وقت تھے انہوں نے فرمایا کہ آپ ترک مشاہرہ کے لیے

مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں مشورہ دلیل تردد ہے اور تردد کی حالت میں ترک اسباب موجب پریشانی ہوتا ہے، ترک اسباب تو اس وقت روا ہوتا ہے جب آدمی مغلوب الحال ہوجاوے۔(۱)

تاریخ دارالعلوم دیوبند میں لکھا ہے: تحصیل علم کے بعد مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ذریعہ معاش کے لیے حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مطبع احمدی دہلی میں اپنے لیے تصحیح کتب کا کام اختیار کیا، اسی زمانے میں حضرت مولا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر صحیح بخاری کے آخری چند سیپاروں کا حاشیہ بھی تحریر فرمایا۔(۲)

نیز تحریر ہے: محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کا ذریعہ معاش پریس اور تجارت کتب تھا، دولت علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دولت دنیوی سے بھی مالا مال کیا تھا، غربا اور طلباء پر فیاضی کے ساتھ خرچ کرتے تھے، آخر عمر میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں طلبہ کو تفسیر وحدیث کا درس دیتے تھے، نہایت متواضع، منکسر المزاج وسیر چشم تھے، مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی ترقی میں اُن کی علمی اور مالی توجہات کا بڑا حصہ ہے مظاہر علوم سے انہوں نے کبھی معاوضہ نہیں لیا۔(۳)

امداد الفتاوی کے شروع میں جہاں اکابرین کے حالات کا تذکرہ ہے وہیں مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے احوال کے ذیل میں لکھا ہے: ''دارالعلوم میں دارالافتاء کی ذمہ داری کے ساتھ بخاری جلد ثانی کا درس بھی دیتے رہے آپ نے ہمیشہ حسبۃً للہ خدمت انجام دی ہے کبھی تنخواہ نہیں لی''(۴)

حضرت شیخ مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: ''اور تجربہ سے واقعی معلوم ہوا کہ تنخواہ دار مبلغین سے وہ لوگ بہت مفید اور کارآمد

---

(۱) فضائل تجارت صفحہ: ۶۰-۶۲

(۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص: ۱۰۶

(۳) تاریخ دارالعلوم دیوبند ص ۱۰۷

(۴) امداد الفتاوی: ۱/ ۱۵۵

ثابت ہوے جو بلا معاوضہ دینی جذبہ سے کام کرتے ہیں'' (۱)

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جب سے علمائے دین اہل فتوی واہل خطابت و وعظ کی خدمت کا انتظام اسلامی بیت المال میں نہیں رہا ان کو اپنی تعلیم اوروعظ و امامت پر تنخواہ لینے کی مجبوری پیش آئی وہ اگر چہ متاخرین فقہاء کے نزدیک بدرجہ مجبوری جائز قرار دی گئی مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس معاوضہ لینے کا اثر تبلیغ ودعوت اور اصلاح خلق پر نہایت برا ہوا جس نے ان کی کوششوں کا فائدہ بہت ہی کم کر دیا۔ (۲)

نیز آپ کی تحریر میں (صفحہ: ۲۲-۲۳) میں خانیہ کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے:

''قال الشيخ الإمام أبو بكر محمد بن فضل رحمه الله تعالى انما كره المتقدمون الاستئجار لتعليم القران وكرهوا أخذ الأجر على ذلک لأنه كان للمعلمين عطيات في بيت المال في ذلک الزمان وكان لهم زيادة رغبة في أمر الدين وإقامة الحسبة، وفي زماننا انقطعت عطياتهم وانقضت رغائب الناس في امر الآخرة فلو اشتغلوا في التعليم مع الحاجة إلى مصالح المعاش لاختل معاشهم فقلنا بصحة الإجارة ووجوب الأجر للمعلم''۔

جس سے معلوم ہوا کہ اجرت علی التعلیم کو جائز قرار دینے کی ایک اہم وجہ دین وآخرت کے امور میں رغبت کا کم ہو جانا ہے، معلوم ہوا کہ اگر دین وآخرت کی رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور بلا اجرت تعلیم کی ترغیب دی جائے تو یہ عین منشا شریعت کے مطابق ہے۔

درج زیل فتوے سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے:

---

(۱) تعلیم و تعلم: ۱۶، تبلیغی جماعت پر اعتراضات کے جوابات صفحہ: ۱۶۰

(۲) معارف القرآن: ۶/ ۱۰۸، تعلیم و تعلم ص: ۱۴-۱۵

دارالعلوم دیوبند سے جاری ہونے والے ایک فتویٰ میں تحریر ہے: قرآن شریف کی تعلیم دینا اعلیٰ درجہ کی دینی خدمت ہے شرف کی بات تو یہ ہے کہ بلا اجرت لیے تعلیم دی جائے لیکن ذریعۂ معاش کا جائز بندوبست نہ ہونے کی صورت میں قرآن کی تعلیم دے کر اجرت لینا جائز ہے کیونکہ دینی معاملات میں سستی اور لا پرواہی کی وجہ سے بلا اجرت پڑھانے والے نہیں ملیں گے اور دین کی حفاظت جو کہ قرآن وحدیث کی حفاظت کے ذریعہ ہی ممکن ہے نہ ہو سکے گی اس لیے حفاظت دین کی ضرورت کے پیش نظر فقہائے متاخرین مثل صاحب ہدایہ وغیرہ نے تعلیم قرآن وحدیث اور فقہ نیز امامت پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، قال في الدر: **ويفتي اليوم بصحتها اي (الإجارة) على تعليم القرآن والفقه والإمامة والأذان**۔ الدر مع الرد: ۵/۴۶ ۔ واللہ تعالیٰ اعلم (۱)

مفتی محمد مصعب معین مفتی دارالعلوم دیوبند تحریر فرماتے ہیں: فقہ کا یہ طے شدہ ضابطہ ہے کہ شریعت میں کسی شخص پر واجب شدہ عمل میں، اجارے کا معاملہ کرنا جائز نہیں ہے یعنی کسی کے لیے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے ذمے واجب شدہ عمل کے بدلے اجرت لے..... مذکورہ اصل کی بناء پر پہلے فقہائے کرام نے یہ حکم بیان فرمایا تھا کہ واجب اعمال دینیہ مثلاً: امامت، خطبہ جمعہ، قرآن کا سکھانا اور ان کے علاوہ دیگر عبادتوں کو انجام دینے کے بدلے اجرت لینا جائز نہیں ہے؛ بلکہ جو شخص ان عبادتوں پر قادر ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کو بلا معاوضہ انجام دے، لیکن متاخرین نے جب دیکھا کہ ان واجبات دینیہ کو لوجہ اللہ انجام دینے سے، لوگوں کی ہمتیں پست ہوتی جارہی ہیں اور دوسری طرف بیت المال سے علماء کو وظیفہ ملنا بھی بند ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ان کو کمانے کے لیے وقت فارغ کرنا پڑتا ہے، تو انھوں نے اجرت لینے کی اجازت دے دی، تا کہ

(۱) جواب نمبر: ۱۵۴۴۶۰۔ تعلیم وتعلم صفحہ: ۱۴

قرآن کا سیکھنا سکھانا باقی رہے اور مشاعر دینیہ کی حفاظت کی جا سکے۔(۱)

ہمارے اکابر کی بدرجۂ مجبوری تنخواہ لینے پر بھی کیا کیفیت ہوتی تھی اس کا اندازہ درج ذیل تحریرات سے لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے علامہ حضرت محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیوبند میں تنخواہ لیتے وقت روتے دیکھا آنسو جاری ہیں فرماتے ہیں ہم میں اخلاص ہوتا تو بلا تنخواہ پڑھاتے، مدرسہ دیوبند حضرت شاہ صاحب کو دو سو روپیہ ماہوار دینے پر مصر تھا اور حضرت شاہ صاحب فرماتے کہ میں تو ڈیڑھ سو ہی لوں گا آخر کار فیصلہ پونے دو سو پر ہوا اس کے باوجود تنخواہ لیتے وقت روتے تھے، اسی ضمن میں حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مولوی کے پاس اخلاص کم ہوتا ہے اس کے مقابلہ میں عامی شخص کے پاس اخلاص زیادہ ہوتا ہے، عام آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میں دنیا کے اندر پھنسا ہوا ہوں مولوی ہر وقت اپنے متعلق یہ سمجھا ہوا ہوتا ہے کہ میں اخلاص رکھتا ہوں، دین رکھتا ہوں۔(۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: اس سے بڑھ کر دنیا طلبی کیا ہوگی کہ کتب دینیہ حدیث شریف وغیرہ تنخواہ لے کر پڑھاتا ہوں اور تنخواہ بھی معمولی نہیں تین سو روپیہ ماہوار۔(۳)

ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: اہل و عیال کے مشاغل اور دین فروشی اور دنیا طلبی کا اس قدر انہماک ہے کہ بڑے بڑے دنیا داروں کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا، تقریباً پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لے کر احادیث نبویہ کی تعلیم دیتا ہوں

(۱) شریعت میں عرف کا اعتبار اور اس کے حدود و قیود، ص:۲۲۵-۲۲۶، مرتبہ مفتی محمد مصعب معین مفتی دار العلوم دیوبند

(۲) نصائح عزیزیہ:۹۰-۹۱

(۳) مکتوبات شیخ الاسلام:۲/ ۲۱۴

اور پھر اس میں بھی کس قدر کوتاہیاں ہوتی ہیں، اگر رحمت خداوندیہ نے دستگیری نہ فرمائی تو چھٹکارہ ممکن نہیں۔(۱)

اسی طرح ایک تیسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: ہماری تعلیمات تنخواہوں کی وجہ سے یقیناً محل نظر ہیں: إلا أن یرحم اللہ علینا۔(۲)

علماء متقدمین ومتأخرین کے ان تمام اقوال کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ دینی تعلیم کے لیے تنخواہ اور وظیفہ قبول کرنے کو عزیمت اور افضل قرار دینا بلکہ اعلیٰ درجہ کی عزیمت قرار دینا ان سب کے مطابق فیصلہ ہے یا خلاف؟ اور کیا ان تمام اکابر نے بھی عوامی کفالت کے مروج نظام کو واضح الفاظ میں بے وقار کرنے کی کوشش کی ہے؟ اور کیا اکابر کے یہ تمام بیانات بھی ازروئے شرع درست نہیں ہیں اور ان جیسے بیانات کو آگے پھیلانا اور کسی بھی ذریعے سے اس کی نشرواشاعت کرنا جائز نہیں ہے؟ اور کیا آپ کا اس نظام کو عزیمت اور افضل قرار دینا بلکہ اعلی درجے کی عزیمت قرار دینا صحابہ کے بالکل حسبۃً للہ تعلیمی نظام کو بے وقار کرنے کی کوشش نہیں ہے؟

---

(۱) مکتوبات شیخ الاسلام: ۲/۲۱۱

(۲) مکتوبات شیخ الاسلام: ۳/۵۰

(۵)

اس تحریر میں مذکورہ باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں قابل اشکال ہیں

❁ صفحہ: ۴ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں سے صرف اتنا خلاصہ نقل کرنا کہ ''حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلافت قبول کرنے کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے متفق ہوکر بیت المال سے آپ کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور آپ نے وظیفہ کو قبول فرمایا تھا'' اور آپ رضی اللہ عنہ کے وظیفہ کو قبول کرنے سے عدم اطمینان کا اظہار اور وفات کے وقت اس سب کو واپس کرنے کے حصے کو حذف کرنا یہ واقعہ کی تصویر کو پلٹ دینے کے مرادف ہے، بلکہ صاحب اعلاء السنن نے ان لوگوں کے فعل پر تعجب کا اظہار کیا ہے جنہوں نے حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کے خلافت ملنے کے وقت بیت المال سے رزق لینا تو دیکھا، لیکن آخر عمر میں ان کا لیا ہوا پورا مال بیت المال میں واپس کرنے سے آنکھیں بند کرلیں ان کا ماننا ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے تو قول رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتثال میں ایسا کیا، کیونکہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اشراف وسوال کے ملنے والے عطیہ کو بغیر لیے ایثار کر دینے سے افضل یہ ہے کہ اس کو اپنے قبضے میں لے کر پھر صدقہ کرے کیونکہ نفس میں مال کی حرص ہوتی ہے تو اپنے قبضے میں آنے کے بعد صدقہ کرنا نفس پر اور زیادہ شاق ہوتا ہے ان کی پوری عبارت اس طرح ہے:

''قلت فامتثل ابو بكر وعمر رضي الله تعالى عنهما قول رسول الله صلى الله عليه وسلم في العمالة ''خذه فتموله وتصدق به فما جاءك من هذا المال وأنت غير مشرف ولا سائل فخذه وإلا فلا تتبعه نفسك'' فاخذا رضي الله تعالى عنهما العمالة ثم تصدقا به على بيت

المال وهذا افضل من إيثار المرء بعطائه عن نفسه من هو أفقر إليه منه فإن أخذه للعطاء ومباشرته للصدقة بنفسه أعظم لأجره وهذا يدل على عظيم فضل الصدقه بعد التمول لما في النفوس من الشح على المال قاله ابن بطال كما في فتح الباري - قلت - ولا يخفى ان مثل هذا التسبب اشد على النفس واحز من ترك التسبب رأسا فكان الشيخان رضي الله تعالى عنهما سيدي التاركين وان كانا في الظاهر من المتسببين فعجباً ممن راى اخذهما الرزق من بيت المال حين وليا الأمر وأغمض عينيه عن ردهما كل ما اخذاه على بيت مال المسلمين في آخر العمر۔ (۱)

❁ شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا قدس سرہ کی فضائل تجارت سے کاٹ کاٹ کر صرف اتنی عبارتیں پیش کی گئیں جس سے کچھ اپنا مطلب نکل سکتا تھا اور جو اس کے خلاف تھیں وہ ساری باتیں حذف کردی گئیں مثلا یہ تو نقل کیا گیا کہ ''اگر اجارہ دینی کاموں کے لیے ہو تو وہ تجارت سے بھی افضل ہے'' لیکن اس پر حضرت نے آگے جو تحریر فرمایا ''لیکن ابو داؤد شریف کی ایک حدیث سے اشکال ہے....'' اس پورے کلام کو حذف کر دیا، اسی طرح ''بے تنخواہ مدرس جس بے توجہی سے کام کرتے ہیں تنخواہ دار نہیں کرتا'' اور ''اسی واسطے ہمارے اکابر کا یہی دستور رہا ہے'' ان دونوں عبارتوں کے درمیان سے ایک لمبی عبارت حذف کر کے ایک دوسرے معنی پیدا کر دیے گئے، یہاں تک کہ تمام ماعلیہ ومالہ سے فارغ ہو کر جو حضرت نے پوری بحث کا حاصل اور نتیجہ تحریر فرمایا اس کو بھی حذف کر دیا گیا، یہ دیانت علمی کے خلاف ہے، حضرت نے پوری بحث کا جو حاصل ونتیجہ تحریر فرمایا ہے

---

(۱) إعلاء السنن—باب رزق القاضي والعاملين عليها، شرح ابن بطال وفتح الباري—باب رزق الحكام والعاملين عليها۔

اس کو ہم ماقبل میں نقل کر چکے ہیں۔

- اسی طرح سے امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ کی احکام القرآن اور زیلعی کی تبیین الحقائق کی عبارتوں کے نقل کرنے میں اور ابوعبید کی کتاب الاموال سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کرنے میں بھی نامناسب اختصار کیا گیا جن کی تفصیل ماقبل میں گزر چکی ہے۔
- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے امور دینیہ میں اشتغال کے ساتھ کسب وتجارت کی اہمیت کے استنباط پر اس بنیاد پر اعتراض کیا گیا کہ امام بیہقی نے تو اس سے قاضی کے لیے تجارت کی کراہت پر استدلال کیا ہے، حالانکہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ پر باب منعقد کیا ہے: **"باب کسب الرجل وعمله بیده"** اور ایک حدیث سے ایک مسئلہ کے استنباط سے یہ کیا لازم آتا ہے کہ اسی حدیث سے کسی دوسرے مسئلہ کا استنباط نہیں کیا جا سکتا، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایک حدیث سے دسیوں مسئلوں کا استنباط کرتے ہیں، واضح رہے کہ حضرت مولانا یوسف صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حیاۃ الصحابہ میں حدیث مذکور کو ابواب الزهد میں بھی بیان کیا ہے اور ابواب ردالمال میں بھی، اس وجہ سے تحریر مذکور کی ص: ۱۱ پر یہ عبارت نظر ثانی کی محتاج ہے، "الحاصل: ماقبل کی تفصیلات سے یہ بات صاف ہوگئی کہ مقرر صاحب نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے جو دور از کار اجتہادات واستنباطات کئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں اور حیاۃ الصحابہ کے ترجمۃ الباب اور اصل واقعہ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے"۔
- اسی طرح سے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ اور حضرات سفیانین وغیرہ کی نیت سے تجارت کرتے تھے اس میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے عمل سے علم وتجارت کے درمیان جمع کرنے کا استدلال تو کیا نہیں حالانکہ اس استدلال میں کسی قسم کے تکلف کی بھی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کی صراحت بھی موجود ہے: **قال العباس بن مصعب : جمع الحدیث والفقه**

والعربية والشجاعة والتجارة والسخاوة والمحبة۔(۱)
اوراس کے برعکس اس سے تعلیم دین پر وظیفے کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس استدلال میں کتنا تکلف ہے وہ کسی پر پوشیدہ نہیں کیونکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ان حضرات پر خرچ کرنا بطور ہدیہ کے تھا بطور وظیفے کے نہیں کما لا یخفی، نیز ان اکابر علماء سے یہ امید بھی نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس ہدیے کی امید پر بیٹھے رہتے ہوں گے بلکہ یہ حضرات تو کمال استغناء کے ساتھ کمائی کی معمولی شکلوں پر قناعت کر کے پورے انہماک کے ساتھ تعلیم دین میں مشغول تھے اور اللہ تبارک وتعالی اپنی سنت قدیمہ "ومن يتوكل على الله فهو حسبه" کے قاعدے کے مطابق مختلف شکلوں سے ان کا تکفل فرماتے تھے، محض ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ قول سے ائمہ مذکورین کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ وہ کسب وتجارت کو کلی طور پر ترک کر کے تعلیم دین میں مشغول تھے یہ بھی کافی جلد بازی میں کیا ہوا فیصلہ ہے کیونکہ یہ حضرات نہ ایسا کرتے تھے اور نہ ایسا کرنے کو پسند کرتے تھے کیونکہ ان حضرات سے کسب وتجارت بھی ثابت ہے اور ترک کسب والوں پر نکیر بھی، چنانچہ امام ابوبکر خلال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی معروف کتاب (الحث على التجارة والصناعة والعمل والانكار على من يدعي التوكل في ترك العمل والحجة عليهم في ذلك) (۱۷) میں امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا کہ ان سے پوچھا گیا "سفيان الثوري في اي شيء خرج الى اليمن؟ قال خرج للتجارة وللقي معمر"۔ اور (۱۸) میں مسیب ابن واضح سے نقل کیا ہے: قال لي يوسف بن اسباط: مات سفيان الثوري وخلف مئتي دينار قلت له ومن اين كان له مئتا دينار وهو زاهد العلماء قال كان يضع الشيء بعد الشيء مع اخوانه فبورك له فيه۔ اور (۲۰) میں سفیان ثوری ہی سے نقل کیا ہے: المال في هذا الزمان سلاح۔ اور (۲۲) میں محمد

---

(۱) الفوائد البہیۃ ص: ۱۰۴

بن ثور رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے: ''كان سفيان الثوري يمر بنا ونحن جلوس في المسجد الحرام فيقول ما يجلسكم فنقول فما نصنع قال: اطلبوا من فضل الله ولا تكونوا عيالا على المسلمين'' اور (۲۳) میں سفیان ثوری ہی سے نقل کیا ہے: يجب على الرجل طلب العلم اذا كان عنده ملء كفه طعاما۔ اور (۴۵) میں سفیان ابن عیینہ سے نقل کیا ہے: عن ابى اسحاق قال: كانوا يرون السعة عونا على الدين قيل لسفيان: سفيان الثوري ذكره؟ قال نعم۔ اور (۲۹) میں فضیل بن عیاض کے خادم فیض بن اسحاق سے نقل کیا ہے: سالت الفضيل بن عياض قلت لو ان رجلا قعد في بيته زعم انه يثق بالله فياتيه برزقه قال يعني اذا وثق به حتى يعلم انه قد وثق به لم يمنعه شيء اراده ولكن لم يفعل هذا الانبياء ولا غيرهم وقد كانت الانبياء يؤاجرون انفسهم وكان النبي صلى الله عليه وسلم آجر نفسه وابو بكر وعمر ولم يقولوا نقعد حتى يرزق الله عز وجل وقد قال الله تعالى في كتابه: «وابتغوا من فضل الله''فلا بد من طلب المعيشة۔ اورخطیب بغدادی نے الجامع لاخلاق الراوی وآداب السامع (۵۰) میں عبدالرحیم بن سلیمان رازی سے نقل کیا ہے: قال: كنا عند سفيان الثوري فكان اذا اتاه الرجل يطلب العلم سأله: هل له وجه معيشة؟ فان اخبره انه في كفاية امره بطلب العلم وان لم يكن له في كفاية امره بطلب المعاش۔ اور بیہقی نے شعب الایمان میں (۶۹۶۸) میں سفیان بن عیینہ سے نقل کیا ہے: يا معشر القراء ارفعوا رؤوسكم لا تزيدوا الخشوع على ما في القلب فقد وضح الطريق فاتقوا الله واجملوا في الطلب ولا تكونوا عيالا على المسلمين۔

معلوم ہوا کہ ائمۂ مذکورین نے خود تجارت بھی کی اور مضاربت وغیرہ کی شکلیں بھی اختیار کیں اور دوسروں کو بھی اسی کی ترغیب دی۔

❁ اس تحریر کے آخر میں جو دس صفحات صرف حوالوں کے لیے رکھے گئے ہیں اس میں

صرف تین چار سطریں ہیں جو دینی تعلیم پر اجرت سے متعلق ہیں باقی سب ارزاق وغیرہ اجماعی مسئلوں سے متعلق ہیں۔

- سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنی طویل (۲۷) صفحات پر مشتمل تحریر جس میں متعدد باتیں بادی النظر میں بھی قابل تحقیق ومراجعت محسوس ہوتی ہیں، یہ کیسے ہو گیا کہ جس دن محرر نے تحریر تیار کی اسی دن تمام موقعین نے دستخط بھی کر دیے، واضح رہے کہ تمام ہی کی دستخط کی تاریخ ۲۴ ذوالقعدہ ۱۴۴۴ ہجری درج ہے۔
- اور ایک قابل تشویش امر اس میں یہ بھی ہے کہ جن دو استفتاؤں کی بنیاد پر یہ تحریر عام ہوئی ہے ان میں سے دوسرے استفتاء کے دستخطوں کی جگہ پہلے ہی استفتاء کے دستخطوں کو کاپی کر کے چسپاں کر دیا گیا ہے اور دونوں ہی میں سے کسی میں بھی کسی بھی دستخط کنندہ کی دستخط کی تاریخ درج نہیں ہے جس کی وجہ سے یہ استفتاء بھی انتہائی مخدوش معلوم ہوتا ہے۔
- اور یہ امر بھی دستخط کنندگان سے قابل استفسار ہے کہ کیا ان میں سے ہر ایک نے دستخط کرنے سے پہلے اس کی تحقیق کر لی تھی کہ نقل مطابق اصل ہے اور اس میں کسی قسم کی قطع وبرید اور حذف واضافہ نہیں ہوا ہے؟ اور بعینہ یہی آخری سوال فتوے پر دستخط کرنے والوں سے بھی ہے۔

اس کی نقل میں کیا کیا ہوا ہے، عرض مرتب میں اور تمہید میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو: تعلیم وتعلم سے متعلق اکابر علماء دیوبند کے نظریات صفحہ: ۴۵، ۴۶

(۶)

اب ہم دینی تعلیم پر اجرت سے متعلق طرفین کے دلائل قدرے وضاحت سے پیش کرتے ہیں:

مانعین کے دلائل:

❁ عن عبد الرحمن بن شبل الانصاري رضي الله تعالى عنه قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول اقرؤوا القران ولا تغلوا فيه ولا تجفوا عنه ولا تاكلوا به ولا تستكثروا به - وفي رواية - كتب معاوية رضي الله تعالى عنه الى عبد الرحمن بن شبل ان علم الناس ما سمعت من رسول الله صلى الله عليه وسلم فجمعهم فقال اني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول تعلموا القران فاذا تعلمتموه فلا تغلوا فيه ولا تجفوا عنه ولا تاكلوا به ولا تستكثروا به۔ (۱)

قال الطيبي: الغالي: من يبذل جهده في تجويد قراءته من غير فكر والجافي: من ترك قراءته ويشتغل بتاويله وتفسيره ولا تستكثروا به اي لا تجعلوه سببا للاكثار من الدنيا. (۲)

❁ عن سهل بن سعد الساعدي رضي الله تعالى عنه قال خرج علينا رسول الله

(۱) رواه عبد الرزاق (۱۹۴۴۴) وابن ابي شيبه (۷۸۲۵) واحمد (۳/۴۲۸) وعبد بن حميد (۳۱۴) وابو يعلى (۱۵۱۸) والطحاوي في شرح معاني الاثار (۲/۱۲) وشرح مشكل الآثار (۴۳۳۲) والبزار كما في كشف الأستار (۲۳۲۰) والطبراني في الاوسط (۲۵۹۵) والبيهقي في السنن الكبرى (۲/۱۷) وفي شعب الايمان (۲۶۲۴) قال الهيثمي رجاله ثقات وقواه الحافظ في الفتح (۹/۱۰۱)

(۲) حاشية شرح مشكل: ۱۱/۱۱۱،

صلى الله عليه وسلم ونحن نقترئ وفي رواية ونحن نقرأ القرآن ويقرئه بعضنا بعضا فقال الحمد لله كتاب الله واحد وفيكم الاحمر وفيكم الابيض وفيكم الاسود اقرؤوه قبل ان ياتي اقوام يقيمون حروفه كما يقام السهم يتعجل احدهم اجره ولا يتأجله - وفي رواية - يتعلمه الاسود والاحمر والابيض تعلموه قبل ان ياتي زمان يتعلم ناس ولا يجاوز تراقيهم ويقومونه كما يقام السهم فيتعجلون اجره ولا يتأجلونه. (١)

❁ عن جابر رضي الله تعالى عنه قال دخل النبي صلى الله عليه وسلم المسجد فاذا فيه قوم يقرؤون القران قال اقرؤوا القران وابتغوا به وجه الله عز وجل من قبل ان ياتي قوم يقيمونه اقامة القدح يتعجلونه ولا يتأجلونه — وفي رواية — خرج علينا رسول الله صلى الله عليه وسلم ونحن نقرأ القران وفينا الاعرابي والعجمي فقال اقرؤوا فكل حسن سيجئ اقوام يقيمونه كما يقام القدح يتعجلونه ولا يتأجلونه. (٢)

❁ عن عبادة بن الصامت رضي الله تعالي عنه قال علمت ناسا من اهل الصفة الكتابه والقرآن فاهدى الي رجل منهم قوسا فقلت ليست بمال وأرمي عنها في سبيل الله تبارك وتعالي فسألت النبي صلى الله عليه وسلم فقال ان سرك أن تطوق بها طوقا من نار فاقبلها — وفي رواية — قال: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا قدم رجل مهاجرا دفعه الي رجل منا فعلمه القرآن فدفع الي رجلا كان معي كنت أقرئه القرآن فانصرفت يوما الي اهلي فرأي أن عليه حقا فأهدي الي قوسا ما رأيت أجود منها عودا ولا أحسن منها عطافا فأتيت النبي

---

(١) رواه ابو داؤد (١/١٢١) واحمد (٥/٣٣٨) والطبراني في الكبير (٦٠٢١، ٦٠٢٢، ٦٠٢٤) وابن حبان (٧٦٠) وابن المبارك في الزهد (٨١٣)

(٢) رواه احمد (٣/٣٥٧) و(٣/٣٩٧) وابو داؤد (١/١٢١) وابو يعلي (٢١٩٧) بسند قوي

صلی علیہ وسلم فاستفتیتہ، فقال: جمرۃ بین کتفیک تقلدتھا او تعلقتھا۔ (۱)

❁ عن ابی بن کعب رضي اللہ تعالي عنہ قال علمت رجلا القرآن فأھدي الی قوسا فذکرت ذلک لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ان اخذتھا أخذت قوسا من نار فرددتھا۔ (۲)

❁ وعن الطفیل بن عمرو الدوسی رضي اللہ تعالي عنہ قال أقرأني أبی بن کعب القرآن فاھدیت لہ قوسا فغدا الی النبی ﷺ وقد تقلدھا فقال لہ النبی صلی ﷺ: تقلدھا من جھنم۔ (۳)

❁ عن اسماعیل بن عبید اللہ قال قال لي عبد الملک بن مروان یا اسماعیل ادب ولدي فاني معطیک قال فکیف بذلک وقد حدثتني ام الدرداء عن ابي الدرداء رضي اللہ تعالي عنھما عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال من یأخذ علی تعلیم القران قوسا قلدہ اللہ قوسا من نار۔

قال الھیثمي: رواہ الطبراني في الکبیر من طریق یحیی بن عبد العزیز عن الولید بن مسلم ولم اجد من ذکرہ ولیس ھو في الضعفاء وبقیۃ رجالہ رجال الصحیح۔ (۴)

قلت: وقد تابعہ عبد الرحمن بن یحیی بن اسماعیل بن عبید اللہ عند البیھقي

---

(۱) رواہ ابو داؤد (۲/ ۳۸۴ و۳۸۵) وابن ماجہ (۱۵۶) والبخاري في التاریخ الکبیر (۱/ ۴۴۴) وأحمد (۵/ ۳۱۵ و۳۲۴) وابن ابي شیبۃ (۷/ ۲۱۲۳) وعبد بن حمید (۱۸۳) والطحاوي في شرح معاني الآثار (۲/ ۱۲) وشرح مشکل الآثار (۴۳۳۳) والحاکم (۲/ ۴۱) و(۳/ ۳۵٦) والبیھقي (٦/ ۱۲۵)

(۲) رواہ ابن ماجۃ (صفحہ: ۱۰٦) والبیھقي (٦/ ۱۲۵ و۱۲٦) والضیاء المقدسی فی الاحادیث المختارۃ (۴/ ۲۲) وعبد بن حمید (رقم: ۱۷۵)

(۳) رواہ الطبرانی فی الاوسط (رقم: ۴۴۲) قال الھیثمي (۴/ ۹۵) فیہ عبد اللہ بن سلیمان بن عمیر ولم اجد من ترجمہ ولا اظنہ ادرک الطفیل۔ قلت: ذکرہ ابن حبان فی الثقات (۷/ ۱۵۳)

(۴) مجمع الزوائد: ۴/ ۹۵

في الكبرى (١٢٦/٦) وقال: ضعيف ونقل عن دحيم انه ليس له اصل قال ابن التركماني اخرجه البيهقي هنا بسند جيد فلا ادري ما وجه ضعفه وكونه لا اصل له۔اه ونقل الزيلعي في نصب الراية (۳۲۹/۴) عن الذهبي انه قال في التنقيح: ليس فيه الا عبد الرحمن هذا قال ابن ابي حاتم روي عنه ابي وسالته عنه فقال صدوق ما بحديثه بأس وقال البيهقي ضعيف وبقية السند صحيح. (١)

قلت: ورواه هشام بن عمار عن عمرو بن واقد عن اسماعيل كما في جامع المسانيد وحلية الاولياء وهذا طريق ثالث. (٢)

❁ عن المثني بن وائل قال اتيت عبد الله بن بشر فمسح رأسي ووضعت يدي على ذراعه فسأله رجل عن اجر المعلم فقال دخل على رسول الله صلى الله عليه وسلم رجل متنكب قوسا فاعجبت النبي صلى الله عليه وسلم فقال ما اجود قوسک اشتريتها قال لا ولكن اهداها الي رجل أقرأت ابنه القران قال فتحب ان يقلدک الله قوسا من نار قال لا قال فردها. (٣)

مذکورہ احادیث قوس کے سلسلہ میں بیہقی نے کہا ہے کہ یہ تو اپنے ظاہر کے اعتبار سے ہمارے ہی نہیں بلکہ حنفیہ کے نزدیک بھی متروک ہیں کیونکہ اگر شرط نہ لگائی ہو تو طالب علم کا ہدیہ قبول کرنا تو ان کے نزدیک بھی جائز ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ حدیث ابن عباس اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم کی حدیث سے منسوخ ہو۔ (۴)

---

(١) وانظر الجرح والتعديل لابن ابي حاتم (١۴٣٢)

(٢) جامع المسانيد (١٣٩/١) وحلية الاولياء (٨٦/٦)

(٣) رواه الطبراني في الكبير كما في جامع المسانيد والسنن (۵٢٣٣) والضياء المقدسي في الاحاديث المختارة (٩٠/٩) قال الهيثمي في المجمع (٩٦/۴) وفيه المثني وولده ذكرهما ابن ابي حاتم ولم يجرح واحدا منهما وبقية رجاله ثقات

(۴) دیکھئے: معرفة السنن والآثار – كتاب النكاح – باب التزويج على تعليم القرآن، نصب الراية – كتاب الاجارات – باب الاجارة الفاسدة

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ معلم اور متعلم نے آپس میں اجرت کی شرط لگالی ہو یا یہ کہ ان کی نیت میں ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کے لیے اس کو پسند نہ کیا ہو۔(۱)

اور صاحب اعلاء السنن کے درج ذیل جوابات سے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ جواب کی تائید ہوتی ہے:

"**قوله في الحديث (فرأى ان عليه حقا فاهدى الي قوسا) يدل على انه كان اعطاء على وجه العوض فلهذا نهاه صلى الله عليه وسلم عنه ويمكن ان يكون من قبيل سد الذرائع لئلا يجترئ الناس على الأجرة فالحديث ليس بمتروك الظاهر عندنا كما زعم البيهقي ولا تعارض بينه وبين حديث ابن عباس وابى سعيد الخدري رضي الله تعالى عنهم في قصة اللديغ لانه ليس فيهما جواز اخذ الأجرة على تعليم القران بل فيهما جواز الأخذ على الرقى وهو غير التعليم فلا نسخ.**(۲)

یعنی صحابی کا اس حدیث میں یہ کہنا کہ اس نے سوچا کہ "اس پر میرا حق بنتا ہے اس وجہ سے اس نے مجھ کو ایک کمان دی" یہ قول دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ یہ دینا عوض کے طور پر تھا اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لینے سے ان کو منع فرمایا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ سد ذرائع کے قبیل سے ہو کہ کہیں لوگ اجرت علی التعلیم پر جری نہ ہو جائیں، اس جواب سے معلوم ہو گیا کہ یہ حدیث ہمارے نزدیک متروک الظاہر نہیں ہے جیسا کہ بیہقی کا دعویٰ ہے اور اس حدیث کا ابن عباس اور ابوسعید رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے جو قصۂ لدیغ کے بارے میں ہے کوئی تعارض نہیں ہے اس لیے کہ ان دونوں حدیثوں میں تعلیم قران پر اجرت

---

(۱) دیکھئے: بذل المجھود: ۴/ ۲۶۳

(۲) اعلاء السنن/ کتاب الإجارة/ باب الإجرة علی تعلیم القرآن

لینے کا جواز نہیں ہے بلکہ ان دونوں حدیثوں میں جھاڑ پھونک پر اجرت لینے کا جواز ہے اور جھاڑ پھونک الگ چیز ہے اور تعلیم قران الگ چیز ہے تو نسخ کا قول اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور بہت سے تابعین کے اقوال سے اسی کی تائید ہوتی ہے:

عن ابن طاووس عن ابيه انه كان لا يرى بأسا ان يعلم المعلم ولا يشارط فان اعطي شيئا اخذه. (۱)

وفي رواية: انه سئل عن معلم يأخذ الأجر فقال: اذا لم يأخذ بشرط فلا بأس به، قال معمر وقال قتادة مثل ذلك. (۲)

وعنه انه كره ان يعلم بشرط. (۳)

وعن عطاء انه كان لا يرى بأسا ان يأخذ المعلم ما اعطي من غير شرط. (۴)

عن الشعبي قال: لا يشترط المعلم وإن أعطي شيئا فليقبله. (۵)

عن الحسن قال: لا بأس أن يأخذ على الكتابة اجرا وكره الشرط. (۶)

عن ابراهيم قال: كان يكره ان يشارط على تعليم القران. (۷)

عن ابي جعفر انه كره للمعلم ان يشارط. (۸)

---

(۱) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۲۵)
(۲) رواه عبد الرزاق (۱۴۵۳۲)
(۳) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۳۲)
(۴) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۲۷)
(۵) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۲۶)
(۶) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۳۱)
(۷) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۲۹)
(۸) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۳۰)

ان تمام آثار کا حاصل یہ ہے کہ طاؤس، عطاء ابن ابی رباح، قتادہ، عامر شعبی، حسن بصری ، ابراہیم نخعی اور امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہم ان سب کا مذہب ہے کے بغیر طے کیے لینے میں کوئی حرج نہیں، البتہ طے کر کے لینا ٹھیک نہیں،

اسی وجہ سے عامر شعبی کے مذکورہ بالا اثر پر مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: ''یعنی اجارہ تو صحیح نہیں، مگر نذرانہ صحیح ہے۔(۱)

ان تمام آثار سے حدیث کی مذکورہ بالا تاویل کی بھی تائید ہوتی ہے اور مذہب حنفیہ کی بھی۔

نیز تحریر میں مذکور بخاری شریف کی عبداللہ بن السعدی والی حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کیونکہ اس کے آخر میں ہے: **فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: خذه فتموله وتصدق به فما جاءك من هذا المال وانت غير مشرف ولا سائل فخذه وإلا فلا تتبعه نفسك**۔ یعنی بغیر اشراف و سوال کے آئے تو لینے میں کوئی حرج نہیں، ورنہ تو شرط لگانا تو دور کی بات دل لگانا بھی مناسب نہیں۔

اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ آپ علیہ الصلوۃ والسلام خود سارے صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے معلم ہونے کے باوجود ان کے ہدایا قبول فرماتے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ طے کر کے لینا تو ناجائز ہے اور بغیر طے کیے لینے میں بھی اگر معاوضہ کا احتمال یا اشراف کا خطرہ ہو اور انہی سے امیدوں کے بندھ جانے کا احتمال ہو تو مکروہ ہے اور حدیث قوس حنفیہ کے یہاں اسی کراہت پر محمول ہے صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں:

حملها ابو حنيفة ومن وافقه على الكراهة دون التحريم بدليل قوله: "ما اتاک من غير مسالة ولا اشراف نفس" الحديث۔ وما كان مكروها من غير شرط فهو بالمشارطة اشد كما لا يخفى(۲)

---

(۱) تحفۃ القاری-۵/ ۳۲۰

(۲) اعلاء السنن / کتاب الاجارۃ / باب الاجرۃ علی تعلیم القرأن

یعنی حنفیہ نے احادیث قوس کو کراہت پر محمول کیا ہے تحریم پر نہیں اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے جس میں ہے کہ جو مال تمہارے پاس بغیر اشراف وسوال کے آئے اس کو لے لو اور ظاہر ہے کہ جو چیز بغیر شرط کے مکروہ ہے شرط لگانے کی صورت میں تو اس میں شدت اور زیادہ ہو جائے گی۔

اسی وجہ سے شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ حدیث قوس اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے ہدیہ قبول کرنے کے سلسلے میں ایک واقعہ ذکر کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں: حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اس عمل اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ قبول ہدیہ کے معاملے میں عالم اور واعظ کا معاملہ زیادہ سخت ہے، اس کے باوجود حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ (اپنے مخصوص) احباب سے ہدیہ قبول کرتے تھے (جہاں معاوضہ کا شبہ نہ ہوتا تھا)۔(۱)

بہت سے صحابہ اور تابعین کے آثار بھی اجرت علی التعلیم کی حرمت یا کراہت پر دلالت کرتے ہیں:

- **قال عمر رضي الله تعالي عنه: اقرؤوا القران وسلوا الله به قبل ان يقرأه قوم يسألون الناس به.(۲)**
- **أخرج ابن ابي شيبة (۳۵۷۷۳) والدارمي (۲۹۰) وابو نعيم في الحلية (۱/۳۰٦) من طريق ليث عن رجل عن ابن عمر رضي الله تعالي عنهما قال: لا يكون الرجل عالما حتي لا يحسد من فوقه ولا يحقر من دونه ولا يبتغي بعلمه ثمنا، وأخرج الدارمي (۲۹۲) وابو نعيم في الحلية (۳/۲۴۳) والبيهقي في شعب الإيمان (۱۷۹۴) من طريق عبيد الله بن عمر العمري عن ابي حازم قال: لا تكون عالما حتي يكون فيک ثلث**

(۱) فضائل صدقات، صفحہ: ۳۳۴)

(۲) رواه ابن أبي شيبة (۲۸۲٦) و (۳۰٦۲۲)

خصال لا يحقر من دونه في العلم ولا يحسد من فوقه في العلم ولا يأخذ علي علمه ثمنا۔ وقال ابن عبد البر في جامع بيان العلم (۸۵۸) وكان يقال: لا يكون الرجل عالما حتي يكون فيه ثلث خصال لا يحقر من دونه في العلم ولا يحسد من فوقه ولا يأخذ علي علمه ثمنا.

- ابراہیم نخعی سے صحیح سند سے مروی ہے: "كانوا يكرهون ان يأخذوا الأجر علي تعليم الغلمان". (۱)
- حضرت عبداللہ بن شقیق سے صحیح سند سے مروی ہے: قال يكره أرش المعلم فإن أصحاب رسول الله صلى عليه وسلم كانوا يكرهونه ويرونه شديدا. (۲)
- عن عمير بن هانئ رضى الله تعالى عنه أن رجلا كان يقرئ رجلا القرآن فحج ذلك الرجل فأهدى الذى أقرأه قوسا فأتى عوف بن مالك فأخبره. فقال له: القها عنك فقال: إنى أريد أن اغزو. فقال: القها عنك. فقال انى أريد أن اغزو بها. فقال له عوف: اتريد ان تعلق قوسا من نار؟ قال فردها الرجل الى صاحبها. (۳)
- حضرت قتادہ سے صحیح سند سے منقول ہے: "قال أحدث الناس ثلاثة اشياء لم يكن يوخذ عليه اجر ضراب الفحل وقسمة الأموال وتعليم الغلمان"۔ یعنی تین کاموں پر اجرت نہیں لی جاتی تھی، نر کی جفتی پر، اموال کی تقسیم پر، بچوں کی تعلیم پر، بعد میں لوگوں نے ایجاد کر دیا۔ (۴)

---

(۱) رواه عبد الرزاق (۱۴۵۳۳) وابن ابي شيبة (۲۱۲۴۰)

(۲) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۳۸) وعبد الرزاق (۱۴۵۳۴)

(۳) رواه سعيد بن منصور (۱۰۸) ورواه الطبراني في الكبير (۱۸/ ۳۵ برقم ۹۲) عن عوف بن مالك مرفوعا والأول اصح۔

(۴) رواه عبد الرزاق: ۱۴۵۳۵

دلائل الخصوم

دینی تعلیم پر اجرت کے مکروہ اور ناجائز ہونے سے متعلق مذکورہ بالا نصوص صریحہ صحیحہ کے مقابلہ میں کوئی حدیث صریح صحیح تو موجود نہیں البتہ قرآن پڑھ کر دم کر کے معاوضہ لینے سے متعلق صحیح احادیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عم خارجۃ ابن الصلت رضی اللہ عنہ وغیرہ سے منقول ہے:

❀ عن أبي سعيد الخدري رضي الله تعالى عنه قال انطَلَقَ نَفَرٌ مِن أَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عليه وسلَّمَ في سَفْرَةٍ سَافَرُوهَا، حتَّى نَزَلُوا علَى حَيٍّ مِن أَحْيَاءِ العَرَبِ، فَاسْتَضَافُوهُمْ فأَبَوْا أَنْ يُضَيِّفُوهُمْ، فَلُدِغَ سَيِّدُ ذلكَ الحَيِّ، فَسَعَوْا له بكُلِّ شَيءٍ، لا يَنْفَعُهُ شَيءٌ، فَقالَ بَعْضُهُمْ: لو أَتَيْتُمْ هَؤُلَاءِ الرَّهْطَ الَّذِينَ نَزَلُوا، لَعَلَّهُ أَنْ يَكونَ عِنْدَ بَعْضِهِمْ شَيءٌ، فأتَوْهُمْ، فَقالوا: يا أَيُّهَا الرَّهْطُ، إنَّ سَيِّدَنَا لُدِغَ، وَسَعَيْنَا له بكُلِّ شَيءٍ، لا يَنْفَعُهُ، فَهلْ عِنْدَ أَحَدٍ مِنكُم مِن شَيءٍ؟ فَقالَ بَعْضُهُمْ: نَعَمْ، وَاللّٰهِ إنِّي لَأَرْقِي، وَلَكِنْ وَاللّٰهِ لَقَدِ اسْتَضَفْنَاكُمْ فَلَمْ تُضَيِّفُونَا، فَما أَنَا بِرَاقٍ لَكُمْ حتَّى تَجْعَلُوا لَنَا جُعْلًا، فَصَالَحُوهُمْ علَى قَطِيعٍ مِنَ الغَنَمِ، فَانْطَلَقَ يَتْفِلُ عليه، وَيَقْرَأُ: (الحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ العَالَمِينَ)، فَكَأنَّما نُشِطَ مِن عِقَالٍ، فَانْطَلَقَ يَمْشِي وَما به قَلَبَةٌ، قالَ: فأوْفَوْهُمْ جُعْلَهُمُ الَّذي صَالَحُوهُمْ عليه، فَقالَ بَعْضُهُمْ: اقْسِمُوا، فَقالَ الَّذي رَقَى: لا تَفْعَلُوا

حتَّى نَأْتِيَ النَّبيَّ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ فَنَذْكُرَ له الَّذي كَانَ، فَنَنْظُرَ ما يَأْمُرُنَا، فَقَدِمُوا عَلَى رَسولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ فَذَكَرُوا له، فَقالَ: وَما يُدْرِيكَ أنَّهَا رُقْيَةٌ؟ ثُمَّ قالَ: قدْ أَصَبْتُمْ، اقْسِمُوا، وَاضْرِبُوا لي معكُمْ سَهْمًا. فَضَحِكَ رَسولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليهوسلَّمَ.(١)

وعن ابن عباس رضي الله تعالي عنهما أنَّ نَفَرًا مِن أصْحَابِ النبيِّ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ مَرُّوا بمَاءٍ، فيهم لَدِيغٌ أوْ سَلِيمٌ، فَعَرَضَ لهمْ رَجُلٌ مِن أهْلِ المَاءِ، فَقالَ: هلْ فِيكُمْ مِن رَاقٍ، إنَّ في المَاءِ رَجُلًا لَدِيغًا أوْ سَلِيمًا، فَانْطَلَقَ رَجُلٌ منهمْ، فَقَرَأَ بفَاتِحَةِ الكِتَابِ علَى شَاءٍ، فَبَرَأَ، فَجَاءَ بالشَّاءِ إلى أصْحَابِهِ، فَكَرِهُوا ذلکَ وقالوا: أخَذْتَ علَى كِتَابِ اللهِ أجْرًا، حتَّى قَدِمُوا المَدِينَةَ، فقالوا: يا رَسولَ اللهِ، أخَذَ علَى كِتَابِ اللهِ أجْرًا، فَقالَ رَسولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عليه وسلَّمَ: إنَّ أحَقَّ ما أخَذْتُمْ عليه أجْرًا كِتَابُ اللهِ۔(٢)

عن خارجة بن الصلت عن عمِّهِ، أنَّهُ مرَّ بقومٍ فأتوهُ، فقالوا: إنَّکَ جئتَ من عندِ هذا الرَّجلِ بخيرٍ، فارْقِ لَنا هذا الرَّجلَ فأتوهُ برجلٍ معتوهٍ في القيودِ، فرقاهُ بأمِّ القرآنِ ثلاثةً أيَّامٍ غدوةً وعشيَّةً، كلَّما ختمَها جمعَ بزاقَهُ، ثمَّ تفلَ فَكَأنَّما أُنْشِطَ من عقالٍ فأعطوهُ شيئًا، فأتى النَّبيَّ صلَّى اللَّهُ علَيهِ وسلَّمَ فذَكَرَهُ لَهُ، فقالَ النَّبيُّ صلَّى اللَّهُ علَيهِ وسلَّمَ: كُل فلَعمري لمن أكَل برقية باطلٍ، لقد أكَلتَ برُقيةِ حقٍّ.(٣)

---

(١) رواه البخاري (٢٢٧٦) و(٥٠٠٧) و(٥٧٣٦) و(٥٧٤٩) ومسلم (٢/٢٢٤) وابوداؤد (٢/٤٨٥)

(٢) رواه البخاري (٥٧٣٧)

(٣) رواه ابوداؤد (٢/٤٨٥)

پہلی روایت کا حاصل یہ ہے کہ ایک سفر کے دوران ایک علاقہ والوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی میزبانی نہیں کی مقدر سے ان کے سردار کو سانپ نے ڈس لیا انھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے علاج و معالجہ کی درخواست کی تو چونکہ انھوں نے میزبانی نہیں کی تھی اس وجہ سے ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے ان سے چند بکریوں پر معاملہ طے کر کے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا وہ اللہ کے حکم سے ٹھیک ہو گیا انھوں نے وہ بکریاں صحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالہ کر دیں واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مسئلہ دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تصویب فرمائی اور فرمایا کہ میرا بھی اس میں حصہ لگاؤ۔

اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان صحابی رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو ناپسند کیا کہ انھوں نے کتاب اللہ پر اجرت لے لی واپسی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ فلاں نے کتاب اللہ پر اجرت لے لی تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ سب سے زیادہ مستحق ہے اس کی کہ اس پر اجرت لی جائے۔

اور تیسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ غلط تو وہ لوگ ہیں جو باطل جھاڑ پھونک سے کھاتے ہیں تم نے تو حق جھاڑ پھونک سے کھایا ہے اس میں کیا حرج ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کے طریق میں "إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله" موجود ہے، جس کے عموم سے استدلال کر کے امام مالک، امام شافعی وغیرہ بہت سے علماء نے دینی تعلیم پر اجرت لینے کو جائز قرار دیا ہے، البتہ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک تعلیم قرآن پر اجرت لینے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن تعلیم فقہ پر اجرت لینا مکروہ ہے۔(۱)

مانعین کی طرف سے اس کے مختلف جوابات بھی دیئے گئے ہیں:

علامہ زیلعی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ہمارے اصحاب

---

(۱) دیکھیے: مختصر اختلاف العلماء کتاب الإجارۃ (۱۷۸۰)

نے اس حدیث کے تین جواب دیئے ہیں:

ایک یہ کہ وہ لوگ کفار تھے اور کفار کا مال لینا جائز ہے۔

دوسرے یہ کہ مہمان کا حق واجب ہے اور انہوں نے مہمانی نہیں کی تھی۔

تیسرے یہ کہ جھاڑ پھونک قربت محضہ نہیں ہے، اس لیے اس پر اجرت لینا جائز ہے۔

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ ہم نہیں تسلیم کرتے کہ جھاڑ پھونک میں اجرت کا جواز، اجرت کے ساتھ تعلیم کے جواز پر دلالت کرتا ہے اور حدیث تو جھاڑ پھونک کے بارے میں ہے۔(۱)

اور امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کہ جھاڑ پھونک کرنا واجب نہیں ہے اس لیے اس پر اجرت لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے اور تعلیم قرآن فرض کفایہ ہے اس لیے اس پر اجرت لینا جائز نہیں، جیسے نماز جنازہ پر اجرت لینا جائز نہیں۔(۲)

شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر مشکوٰۃ میں ہے: **هذا من باب التعويذ ولا خلاف فيه إنما الخلاف في التعليم الذي هو أداء فرض هل يجوز عليه الأجرة أم لا.**(۳)

بلکہ مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: اس سے اجرت کے جواز پر استدلال مشکل ہے کیونکہ بکریاں اگر اجرت تھیں تو وہ صرف جھاڑنے والے کا حق تھیں، سریہ پر اس کی تقسیم اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس میں حصہ رکھنا ذہن کو اس طرف لے جاتا ہے کہ بکریوں کو مال غنیمت قرار دیا گیا تھا۔(۴)

نیز ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: صحیح توجیہ یہ ہے کہ اس کو مال غنیمت قرار دیا

(۱) دیکھئے: نصب الرایہ—كتاب الاجارات—باب الإجارة الفاسدة

(۲) شرح معاني الآثار/باب الإستيجار علي تعليم القرآن

(۳) التقرير الرفيع (۳/۲۶۵)

(۴) تحفۃ القاری: ۱۰/۵۲۴

گیا ہے، کیونکہ وہ کفار سے حاصل ہوا تھا اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مال غنیمت میں ایک حصہ اللہ کا رسول ہونے کی وجہ سے بھی تھا، یا امیر المومنین ہونے کی وجہ سے تھا۔۔۔اس توجیہ سے رقیہ کے جواز پر استدلال ختم ہوجاتا ہے۔(۱)

ایک تیسری جگہ تحریر فرماتے ہیں: جب اس سے تعویذ کی اجرت پر استدلال صحیح نہیں تو تعلیم قرآن کی اجرت پر استدلال کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔(۲)

اور علامہ تور بشتی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دیا ہے کیونکہ اس علاقے والوں نے جوان پر میزبانی کا حق واجب تھا اس کو ادا نہیں کیا تھا اس وجہ سے جھاڑ پھونک کو اپنا حق وصول کرنے کے ذریعے کے طور پر استعمال کیا گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد "إن أحق ما أخذتم عليه أجرا كتاب الله" سے اجر آخرت ہے، یہ حقیقت کی طرف تعریض ہے جس کو اہل بلاغت تحویل کلام کہتے ہیں، ان کی عبارت اس طرح ہے:

قلنا: اراد به اجر الآخرة كان سؤالهم عن اخذ الاجر عليه فعرض هو بما هو الحقيقه فيه والمطلوب منه وهذا النوع من الخطاب يسميه اهل البلاغه التحويل للكلام۔(۳)

نیز امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث قوس کو کسب المعلم پر اور حدیث رقیہ کو کسب الاطباء پر محمول کیا ہے۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عاقل صاحب دامت برکاتہم الدر المنضود(۴) میں تحریر فرماتے ہیں: امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر بڑی فقاہت کا ثبوت دیا۔۔۔اور حدیث عبادہ اور حدیث ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جن کے مضمون میں بظاہر تعارض ہے دونوں پر یکے بعد دیگرے الگ الگ ترجمہ قائم کر کے صحیح صورتحال کو واضح فرمادیا کہ حدیث عبادہ کا تعلق تعلیم قرآن سے ہے اور حدیث ابی سعید خدری کا محمل علاج ومعالجہ اور کسب طبیب ہے فللہ در المصنف۔

---

(۱) تحفۃ القاری:۵/۳۳۲

(۲) تحفۃ الالمعی:۵/۴۰۶

(۳) الميسر في شرح مصابيح السنة-باب الإجارة(۲۱۱۹)

(۴) الدر المنضود(۵/۳۷۷)

بلکہ صاحب اعلاء السنن تو یہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث تو تعلیم قرآن پر اجرت لینے کے عدم جواز پر دلالت کرتی ہے کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ کہنا ''یا رسول اللہ انه أخذ أجرا علی کتاب اللہ'' دلالت کرتا ہے اس بات پر کہ ان کے نزدیک یہ بات معروف تھی کہ کتاب اللہ پر اجرت نہیں لے سکتے، البتہ ان سے اتنی غلطی ہوئی کہ انہوں نے اس حکم کو رقیہ کے لیے بھی سمجھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح بات بتادی کہ رقیہ اس میں داخل نہیں ہے۔(۱)

❁ مجوزین کی دوسری دلیل حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ کی حدیث واہبہ ہے جس کے آخر میں ہے:

ماذا معك من القرآن قال معي سورة كذا وسورة كذا عدّدها فقال تقرأهن عن ظهر قلبك قال: نعم، قال إذهب فقد ملكتكها بما معك من القرآن.(۲)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کچھ قران یاد ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہارے قران کی وجہ سے تمہاری اس سے شادی کردی۔

اس کے بارے میں صاحب اعلاء السنن فرماتے ہیں کہ حدیث میں یہ تصریح نہیں ہے کہ تعلیم مہر ہے بلکہ یہ احتمال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر مہر کے اس کا نکاح کردیا اس کے اکرام میں اور یہ بھی احتمال ہے کہ اس سے نکاح کردیا اس امید پر کہ قرآن کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو مالدار کردیں گے۔

اور اس میں سے پہلا جواب علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی دیا ہے اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ نے موفق ابن قدامہ سے بھی نقل کیا ہے اور ان ہی سے مہر اور اجر کے

---

(۱) دیکھیے: اعلاء السنن، کتاب الاجارۃ، باب الاجرۃ علی تعلیم القرآن

(۲) رواه البخاري (۲۳۱۰) و(۵۰۲۹) و(۵۰۳۰) و(۵۰۸۷) و(۵۱۲۱) و(۵۱۲۶) و(۵۱۳۲) و(۵۱۳۵) و(۵۱۴۱) و(۵۱۴۹) و(۵۱۵۰) و(۵۸۷۱) و(۷۴۱۷) ومسلم (۱/۴۵۷) وأبو داؤد (۱/۲۸۷-۲۸۸) والترمذي (۱/۲۱۱) والنسائي (۲/۱۷) وابن ماجه (ص:۱۳۶)

درمیان وجوہ فرق بھی نقل کی ہیں۔(۱)

اسی طرح بعض آثار سے بھی اجرت علی التعلیم کے جواز پر استدلال کیا گیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

- عن الوضين بن عطاء قال ثلثة معلمون كانوا بالمدينة يعلمون الصبيان وكان عمر بن الخطاب رضي الله عنه يرزق كل واحد منهم خمسة عشر درهما كل شهر۔ (۲)
- عن سعد بن ابراهيم أن عمر بن الخطاب رضي الله تعالي عنه كتب الى بعض عماله ان أعط الناس على تعلم القران فكتب اليه أنك كتبت الى أنْ أعط الناس على تعلم القران فتعلمه من ليست له فيه إلا رغبة الجعل فكتب اليه أنْ أعط الناس على المروءة والصحابة۔ (۳)
- عن العلاء بن السائب قال قال ابن مسعود رضي الله عنه ثلاث لابد للناس منهم لابد للناس من امير يحكم بينهم ولولا ذلك لأكل بعضهم بعضا ولابد للناس من شراء المصاحف وبيعها ولولا ذلك لقل كتاب الله ولا بد للناس من معلم يعلم أولادهم ويأخذ على ذلك أجرا ولولا ذلك لكان الناس أميين۔ (۴)
- عن ابن شهاب أن سعد بن أبي وقاص رضي الله عنه قدم برجل من العراق يعلم أبنائهم الكتاب بالمدينة ويعطونه الأجر۔ (۵)

---

(۱) دیکھئے: اعلاء السنن، كتاب إجارة / باب الأجرة علي تعليم القرآن، حاشية اللامع / كتاب الإجارة / باب ما يعطي في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب، المغني / كتاب الإجارات، البناية / كتاب الإجارات۔

(۲) رواه ابن أبي شيبة (۲۱۲۲۸) والبيهقي (۶/ ۱۲۴)

(۳) رواه ابو عبيد في كتاب الاموال (۶۴۱)

(۴) رواه ابن سحنون في كتاب آداب المعلمين (۱۰)

(۵) رواه ابن سحنون في كتاب آداب المعلمين (۱۳)

- عن خالد الحذاء قال سألت أبا قلابة عن المعلم يعلم ويأخذ أجرا؟ فلم يره بأسا. (١)
- عن شعبة قال سالت معاوية بن قرة عن أجر المعلم قال أرى له أجرا. (٢)
- قال شعبة وسالت الحكم فقال لم أسمع أحدا يكرهه. (٣)
- عن ابن جريج قال قلت لعطاء أآخذ أجرا على تعليم الكتاب علمت أحدا كرهه؟ قال لا۔ (٤)
- عن ابن سيرين قال كان بالمدينة معلم عنده من أبناء أولئک الضخام، قال فكانوا يعرفون حقه في النيروز والمهرجان۔ (٥)
- عن يحيي بن سعيد ابن أخي الحسن قال: لما حذقت قلت يا عماه إن المعلم يريد شيئا، قال: ما كانوا يأخذون شيئا ثم قال أعطه خمسة دراهم، قال: فلم أزل به حتى قال أعطه عشرة دراهم۔ (٦)

ان مذکورہ آثار میں سے کوئی اثر ایسا نہیں جس میں اشتراط بھی صریح ہو اور تعلیم کا دینی ہونا بھی صریح ہو بلکہ ان میں یہ احتمال موجود ہے کہ تعلیم سے لکھنا پڑھنا سکھانا مراد ہو قرآن وشریعت کی تعلیم مراد نہ ہو اور اس کا قرینہ یہ بھی ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے اثر میں ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو سب لوگ امی رہ جائیں گے اور امی اسی کو کہتے ہیں کہ جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو چاہے اس کے پاس شریعت کا علم ہو جیسا کہ حدیث میں ہے: "إنا أمة أمية لا نكتب ولا نحسب"۔

---

(١) رواه ابن أبي شيبة (٢١٢٢٤)
(٢) رواه البيهقي (٦/ ١٢٤)
(٣) رواه البيهقي (٦/ ١٢٤) والبخاري تعليقا
(٤) رواه ابن سحنون في كتاب آداب المعلمين (١٢)
(٥) رواه ابن أبي شيبة (٢١٢٣٦)
(٦) رواه ابن سعد في الطبقات (٧/ ١٧٥-١٧٦) وذكره البخاري (٢٢٧٦) تعليقاً مختصراً۔

اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اثر میں جو ہے کہ عراق سے تعلیم کے لیے ایک شخص کو مدینہ منورہ لے کر آئے، اس سے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ لکھنا پڑھنا سکھانا مراد ہے ورنہ دین وشریعت کی تعلیم کے لیے تو مدینہ منورہ میں بے شمار لوگ موجود تھے۔

اسی طرح حکم رحمۃ اللہ علیہ اور عطاء رحمۃ اللہ علیہ کے آثار میں جو ہے کہ ہم نے نہیں سنا کہ کسی نے بھی تعلیم پر اجرت کو ناپسند کیا ہو اس اطلاق کو بھی دینی تعلیم پر محمول کرنا بہت مشکل ہے، دینی تعلیم پر اجرت کی کراہت پر دلالت کرنے والے ان احادیث وآثار کثیرہ کے ہوتے ہوئے جن کو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں خاص طور پر جب کہ کسی ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے بھی صراحت کے ساتھ یہ ثابت نہیں کہ اس نے قرآن یا شریعت کی تعلیم پر طے کر کے اجرت لی ہو۔

حضرت مفتی سعید صاحب پالنپوری رحمۃ اللہ علیہ بھی تحریر فرماتے ہیں: معلم سے کونسا معلم، مراد ہے؟ یہ بات واضح نہیں، کیونکہ معلم تو طاعت مقصودہ کے علاوہ دوسری چیزوں کی بھی تعلیم دیتا ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔(۱)

اور اس کی تائید درج ذیل روایت سے بھی ہوتی ہے۔

عن ابن عباس رضي الله عنهما قال لم يكن لأناس من أسارى بدر فداء فجعل رسول الله صلى الله عليه وسلم فداءهم أن يعلموا أولاد الأنصار الكتابة.(۲)

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ بدر کے بعض قیدیوں کے پاس فدیہ نہیں تھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ طے فرمایا کہ وہ فدیے کے بدلے میں انصار کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔

اگرچہ بیہقی نے تو حیرت انگیز طور پر اس روایت سے بھی تعلیم قران پر اجرت کے جواز پر استدلال کر لیا اور یہ بھی نہیں خیال کیا کہ اس میں معلم مشرک ہیں اور تعلیم کتابت کی

---

(۱) تحفۃ القاری:۵/۳۲۰

(۲) رواه البيهقي(۶/۱۲۴-۱۲۵)

ہے قران کی نہیں۔

نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پہلے اثر میں اجرت کا طے کرنا ثابت نہیں ہوتا اسی وجہ سے قاضی اطہر مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں بچوں کی تعلیم کے لیے تین معلم مقرر کئے اور ہر ایک کو ماہ بماہ پندرہ درہم دیتے تھے، اس میں ''یرزق'' کا لفظ ہے اجرت نہیں ہے۔(۱)

نیز آپ کی تحریر میں بھی صفحہ: ۷ پر ''پندرہ درہم برائے خورد ونوش دیتے تھے'' کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ یہ اجرت نہیں ہے۔

اور دوسرے اثر سے بھی نفس اجرت ہی ثابت نہیں ہوتی جیسا کہ سابق میں ہم تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کر چکے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآن کے تعلیم وتعلم پر اجرت لینے کی بات کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ آپ تعلم قرآن پر انعام کے اعلان سے بھی متفق نہیں جیسا کہ ابوعبید قاسم بن سلام نے کتاب الاموال میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ اثر کے معاً بعد (۶۴۲) میں روایت کیا ہے:

عن أسير بن عمرو قال بلغ عمر أن سعدا قال من قرأ القرآن ألحقته في ألفين فقال: أف أف أيعطي على كتاب الله؟

یعنی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات پہنچی کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے یہ اعلان کیا ہے کہ جو قرآن پڑھے گا میں اس کو ان لوگوں میں شامل کر دوں گا جن کو بیت المال سے دو ہزار وظیفہ ملتا ہے۔ تو اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اف اف کیا کتاب اللہ پر دیا جائے گا؟

واضح رہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو تعلم قرآن کی بنیاد پر دینے کی بات لکھی تھی وہ اعلان والی شکل نہیں تھی اگرچہ وہ رائے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بعد میں بدل گئی اور یہاں جو سخت نکیر فرمائی وہ اعلان پر ہے فلا تعارض۔

---

(۱) خیر القرون کی دینی درسگاہ، ص: ۳۵۵

ابن سیرین اور حسن بصری رحمہما اللہ علیہما کے اثر سے بھی عدم اشتراط واضح ہے اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اثر میں لفظ ''حذقت'' مشیر ہے اس بات کی طرف کہ اس سے لکھنا پڑھنا سکھانا مراد ہے اور اس سب کے باوجود اس میں جواز سے زیادہ کراہت ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا زکریا رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، حضرت تحریر فرماتے ہیں:

وانت ترى أن الحسن قال أولاً ما كانوا يأخذون شيئا ثم أعطاه تطييباً لخاطر ابن عمه بدون الشرط وأثره الثاني يؤمي الى أنه أباح الأجر على الكتابة فلا بعد في أنه اعطاه في أثر يحيى بن سعيد أيضا على الكتابة۔اھ۔(١)

اس کے بارے میں بھی مفتی سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اس میں بھی صراحت نہیں کہ معلم نے کیا پڑھایا تھا''۔(٢)

خلاصہ یہ نکلا کہ دین وشریعت اور قرآن کی تعلیم کی تو مذکورہ آثار میں سے کسی بھی اثر میں صراحت نہیں ہے سوائے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوسرے اثر کے اور اس کا حال پہلے ہی واضح کیا جاچکا ہے، بلکہ اکثر آثار میں اس کے خلاف کی صراحت یا قرینہ موجود ہے۔

اور اکثر آثار سے اشتراط بھی ثابت نہیں ہوتا۔

ایسی صورت میں حرمت یا کراہت پر دلالت کرنے والے دلائل صریحہ کے مقابلے میں اباحت پر دلالت کرنے والے دلائل غیر صریحہ کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ دونوں اگر قوت وصراحت میں برابر بھی ہوتے تو محرِم ہی کو ترجیح ہوتی۔

مذکورہ بالا تمام دلائل کی روشنی میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا درج ذیل نظریہ کتنا مضبوط

---

(١) حاشية لامع الدراري — كتاب الإجارة — باب ما يعطي في الرقية على أحياء العرب بفاتحة الكتاب۔

(٢) تحفۃ القاری:٥/٣٢٠

معلوم ہوتا ہے۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

وقال أبو حنيفة اذا استاجر رجل رجلا يعلم ولده القران كل شهر باجر معلوم فانه لا يصلح ولا يحل وكذلك لو اشترط عليه ان يعلمه كل سورة من القران بكذا وكذا وكذلك لو اشترط عليه ان يعلمه الفقه والفرائض۔(۱)

وإذا استأجر رجل رجلا ليكتب له مصحفا أو فقها معلوما بأجر مسمي فهو جائز وليس هذا كتعليم القرآن.(۲)

وكذلك هذا الباب في تعليم الكتاب والخط والحساب والهجاء في الحروف فهو جائز مستقيم۔(۳)

وقال العيني: قيد بالفقه، لانه يجوز الاستئجار لاجل قراءة العلوم الأدبية كاللغة والنحو والتصريف ونحوها۔(۴)

---

(۱) كتاب الأصل: ۴/۲۰

(۲) كتاب الأصل: ۴/۲۳

(۳) كتاب الأصل: ۴/۴۰

(۴) بناية—كتاب الإجارات

حرف آخر

اس تحریر میں ہمیں اس کا خطرہ ہے کہ

نالہ کر لینے دیں للہ نہ چھیڑیں احباب
ضبط کرتا ہوں تو تکلیف سوا ہوتی ہے

کی کیفیت کے جھونکے میں کہیں لہجے میں تیزی نہ آ گئی ہو ویسے ہم نے اس کی بہت کوشش کی ہے کہ شیخ عوامہ دام مجدہ کی اس قیمتی نصیحت پر پوری طرح عمل ہو کہ ''نقد و تحقیق کی خدمت بجالاتے وقت محقق اور ناقد کو نقد اور ادب کی دونوں ہی پیمانوں کے درمیان توازن رکھنے کا اہتمام کرنا ہوگا اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے سے بچنا ہوگا؛ کیوں کہ اگر صرف نقد کو پیش نظر رکھ کر غلطی کو اجاگر کرنے میں حد سے آگے بڑھے تو بے ادبی کا مرتکب ہوگا، اور اگر مولف کے ادب کو ترجیح دیتے ہوئے غلطی کی وضاحت میں کمی کرے گا تو وہ علم کے ساتھ ناانصافی کرنے والا ہوگا، اس لیے تنقید بہر حال ادب اور اعتدال کے دائرے میں ہونی چاہئے''(۱)

اور پوری کوشش کی ہے کہ بڑوں کی شان میں کوئی بے ادبی نہ ہو اگر خدانہ خواستہ ایسا کچھ ہوا بھی ہے تو رب کریم سے قوی امید ہے کہ ''بقدر سد رمق حل میتۃ'' سے زیادہ نہیں ہوا ہوگا کیونکہ اکابر و اہل علم و فتوی کے وقار و عظمت کو ملحوظ رکھنا امت کے دین و ایمان کے تحفظ کے لیے بہت ضروری ہے لیکن دوسری طرف موجودہ زمانے میں امت میں دینی بیداری پیدا کرنے کے اعتبار سے عالمی سطح پر مرکز نظام الدین کی جو نوعیت ہے کہ کتنی قومیں، کتنے قبیلے،

(۱) معالم ارشادیہ مصنفہ محدث العصر شیخ محمد عوامہ حلبی حفظہ اللہ، تلخیص و ترجمانی از مفتی محمد سلمان صاحب منصور پوری زید مجدہ بنام ''علماء وطلبہ کے لیے فکر انگیز اور کارآمد باتیں''، صفحہ: ۴۰۱

کتنے علاقے دنیا میں ایسے ہیں کہ مرکز نظام الدین ہی سے ہونے والی فکروں کی برکت سے ان میں کچھ دین کی طرف رغبت پیدا ہوئی ہے ایسے میں اگر مرکز کے سربراہ کے بارے میں سخت تبصرے کر کے مرکز کو عالمی سطح پر مجروح کرنے کی کوشش کی گئی اور امت کو مرکز سے بد دل کرنے کی کوشش کی گئی تو دینی اعتبار سے اس کا نتیجہ بہت خطرناک ہوگا کیونکہ ہمارے پاس دعوت کی اس عظیم محنت کے علاوہ اور کوئی محنت ایسی نہیں جس میں غفلت اور بے دینی کے اڈوں میں گھس گھس کر دینی شعور پیدا کرنے کی محنت ہورہی ہو یہ بڑی سوچنے کی بات ہے کہ جو شخص ایک مدرسے کا مہتمم اور شیخ الحدیث ہو اور اس کے ہزاروں شاگرد اور لاکھوں مریدین اور کروڑوں مامورین ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوے ہوں اس کے بارے میں کج فکری، کم علمی، اہلیت کا نہ ہونا، سیرت کا عنوان بھی جہالت پر مبنی ہے، درایت اور فہم کی کمی کی وجہ سے سطحی اور غلط اجتہاد کرنا، عصمت انبیاء کی حساسیت ونزاکت سے بھی مطلقا ناواقف ہیں، کم علمی کے باوجود بیجا تنقید کرتا ہے، غلط و گمراہ کن افکار ونظریات، کم علمی اور طبیعت کی ازادی، دین کے سلسلے میں بے راہ روی کا شکار جیسے الفاظ مناسب ہیں؟(۱)

اور اس بات کے ثابت ہونے کے بعد ان سخت تبصروں کی شناعت اور بھی زیادہ شدید ہو جاتی ہے کہ شخص مذکور کی جن باتوں کو اس تحریر میں تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ سب اکابر وسلف کے کلام میں بکثرت موجود ہیں نیز شخص مذکور کے نظریات سے محررین مطلقا ناواقف ہیں؛ کیونکہ ان کے پاس صرف وہی باتیں پہنچی ہیں جن کو مخالفین نے کاٹ چھانٹ کر پہنچائی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ، وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ.

---

(۱) ملاحظہ ہو(ص:۳-س:۱۴)اور(ص:۱۴-س:۲۲)اور(ص:۱۶-س:۹و۱۴و۲۰و۲۱)

ایک اہم گزارش

ہماری گزشتہ کتاب ''حضرت مولانا محمد سعد صاحب دامت برکاتہم کے افکار اقوال سلف کی روشنی میں''، ''تعلیم و تعلم سے متعلق اکابر علماء دیوبند کے نظریات'' اور ''اس کتاب'' کو اکابر کی جن کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے، مثلاً: ''جماعت تبلیغ پر اعتراضات کے جوابات'' مصنفہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ''مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کی دینی دعوت'' مصنفہ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ''ملفوظات مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' مصنفہ مولانا منظور نعمانی، ''ارشادات و مکتوبات مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' مصنفہ مولانا افتخار فریدی ''کیا تبلیغی کام ضروری ہے؟'' مصنفہ مولانا الیاس بن بندہ الہی ''مجموعہ بیانات مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ''، ''مکاتیب مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ''، ''مواعظ عبیدیہ''، ''خطبات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ'' خاص طور پر علم و دعوت سے متعلق وغیرہ وغیرہ، نیز ''حیاۃ الصحابہ'' کو کثرت کے ساتھ اپنے مطالعہ میں رکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم اس کام کی بنیادوں کو اچھی طریقہ سے سمجھ سکیں اور اس کام کی پوری بصیرت پر رہیں، اور مختلف قسم کے اشکالات کی وجہ سے ہم کسی قسم کے ذہنی انتشار کا شکار نہ ہو جائیں۔